بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کیا سیکولر پاکستان قائداعظم کا خواب تھا؟

17 دسمبر 2002ء کے اخبارات میں' پاکستان میں متعین امریکی سفیر نینسی پاؤل کا ایک بیان نمایاں طور پر شائع ہوا جس کا متن کچھ یوں ہے:

''پاکستان میں امریکی سفیر نینسی پاؤل نے کہا ہے کہ ہماری خواہش ہے
کہ پاکستان قائداعظم کے خوابوں کے مطابق' روادار اور سیکولر ملک بنے'
جہاں تمام شہریوں کو تمام حقوق حاصل ہوں۔''

ہم منتظر رہے اس بات کے کہ ہمارے دانشوروں میں سے کسی کی طرف سے کوئی جواب آئے گا مگر حیرت اور تاسف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج تک (19 دسمبر 2002ء)' یعنی تین دن بعد بھی کسی دانشور' کسی سیاست دان کی جانب سے نہ تو کوئی جوابی بیان شائع ہوا ہے اور نہ ہی اس بیان کی تردید درجنوں اخبارات کے سینکڑوں کالم نویسوں میں سے کسی ایک کے کالم کا موضوع بن سکی ہے۔

طلوع اسلام اس ضمن میں 1948ء سے برابر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کے قارئین یہ کہہ اٹھتے ہوں گے کہ ایک ہی راگ سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ جب تک ممکن ہے ہم اسے مسلسل دہرائے چلے جائیں گے کیونکہ ہم اسے اپنا دینی وملی تقاضا سمجھتے ہیں۔ اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ سیکولر پاکستان کو قائداعظم علیہ الرحمتہ کے ''خواب'' سے تعبیر کیا جانے لگا ہے۔ للہ العجب!

قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ اس لئے کہ تھیاکریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قائداعظمؒ کا ایک بیان روزنامہ انقلاب لاہور کی 23 مارچ 1932ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا' جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری' ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور

آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک ایسے قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی' بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تا کہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ''اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ۔۔**حسبنا کتاب اللہ** ''ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' (خطبات اقبالؒ)۔

قائداعظمؒ نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ ''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں ..... رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل' کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔۔ (تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول' ص 48)۔

اس سے ان کی مراد' تھیا کریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1942ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (تقاریر جناحؒ' شائع کردہ شیخ محمد اشرف' جلد دوم' ص 386)

وہ تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو 1941ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی

اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔
(اورینٹ پریس بحوالہ' روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 فروری 1942ء)

سوال یہ ہے کہ قائداعظم اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظم اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قائداعظم نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر' مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا:

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر' مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام' یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خوامخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد' معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔ (ہندوستان ٹائمز 1938-9-5)۔

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔ (ہندوستان ٹائمز 1939-11-14)۔

1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق' تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز' 1940-6-9)۔

اس رو میں مسٹر گاندھی نے 1946ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم' میں اس کے لئے

جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں' مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔(ہریجن' 1946-12-9)۔

مسٹر گاندھی کا یہ ردعمل' قائداعظم کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری 1940ء کو لکھا تھا۔اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی) سے کہا تھا:

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔لیکن خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے (لہٰذا' مذہب اور سیاست' دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی' معاشی' سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں' میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں' محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔(تقاریر جناحؒ' حصہ اول' ص 140-139)۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا' وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے مثلاً اپریل 1943ء کا ذکر ہے۔صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔آپ نے جواب میں فرمایا:

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔میں تمہیں کیا پیغام دوں جب کہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم' قرآن کریم۔(تقاریر' جلد اول' ص 516)۔

۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد ہو رہے تھے۔آپ نے قوم سے کہا:

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟ (تقاریر' جلد اول' ص ۱۰۸)۔

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی یہ سوال اٹھایا:

> وہ کون سا رشتہ ہے۔ جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی عظیم کتاب، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔۔۔۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریر، جلد دوم، ص ۵۰)۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہِ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:

> اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اسکا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے رسول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔''

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

> اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریب ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم، دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔ (تقاریر، جلد دوم، ص ۳۰۰)۔

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس میں جب طلباء نے یہ سوال کیا کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم

کیا ہیں؟'' تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:

جب میں انگریزی زبان میں مذہب Religion کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رو سے' میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدومد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

اب آیئے قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف' جسے یہ ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جس پر محترم جسٹس محمد منیر صاحب نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے' بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دوقومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے اسلامی مملکت کے تصور کی نفی کر دی تھی' بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیم ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو پاکستان کی پہلی مجلس آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو) اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے' قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف وحوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں' اس لئے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا۔۔۔ پاکستان میں صورت حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں' اس لئے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف وہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنابریں' یہاں کا ہندو اس لئے بھی خائف ہوسکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی

تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوگا۔ انہوں نے جملہ اہل پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

۔۔۔۔تم آزاد ہو' تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں' یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو' اس کا امور مملکت سے کچھ تعلق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ (اور تو اور) انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں۔۔۔۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ۔۔۔۔ میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس مملکت نے' اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ مناقشات کو مٹا دیا اور ''اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں' بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔'' اسی طرح:

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو' ہندو رہے گا' نہ مسلمان' مسلمان۔۔۔۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں' کیونکہ وہ ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا' ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے' سیاسی نقطہ نگاہ سے ہوگا۔

یہ ہیں قائداعظمؒ کے وہ الفاظ جنہیں سپر بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ کہے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ (تحریک پاکستان کی) زندگی اور اس دوران میں اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات' تقاریر' خطابات ہمارے سامنے ہوں' اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے' اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ (نہایت دیدہ دلیری سے) کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائداعظمؒ دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ وہ یہ کچھ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بر بنائے عقیدت نہیں کہتے' بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے' وہ ان کے خلاف اس قسم کے الزام عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیات تھیں' جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونے کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک' ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔

ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت' واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ (جیسا کہ محترم جسٹس نے خود اپنی کتاب میں تسلیم کیا ہے) تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارتگری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا اور تو اور دلی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس' بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو' نہ اسلحہ' نہ سامان ہو نہ پیسہ' تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی؟ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے' اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا' اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسے مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدت جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ' ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذر آتش کر

دیں گے' بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلموں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے' یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟..... مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان ۔۔ Rationale of Pakistan Constitution تھا۔ اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی رو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون ہیں۔ یعنی .....

۱۔ مملکت پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کی یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو' ہندو ہے۔ نہ مسلمان' مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ۔۔۔۔ جو خود اس پاکستان کے خالق تھے ۔۔۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی' بالکل پاگل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوقِ شہریت حاصل ہوں گی۔

اس کے بعد ہمیں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائداعظمؒ کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے' آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے تھے۔ اس لئے اب سند ان کی آخری تقریر ہی ہو سکتی ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ قائداعظمؒ اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے۔ اور (اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ) انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہوگی۔ انہوں نے فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام جو پیغام براڈ کاسٹ کیا تھا اس کے شروع میں کہا تھا:

مملکت پاکستان' جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین نصب العین کا ایک حد تک حصول ہے' 15 اگست 1947ء کو وجود میں آ گئی تھی۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامک سٹیٹ اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' 63)۔

قائداعظمؒ نے اسی ماہ (فروری 1948ء میں) آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا:

مغربی پاکستان' مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرون ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں' جن میں اس قدر بُعد ہو' وحدت حکومت کس طرح ممکن ہوگی میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے:

ایسا' ہمارے ایمان کی رو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر' ایمان اپنے آپ پر' ایمان مستقبل پر' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہ سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا:

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق' شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں' ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات ہم اپنے اسالیب فکر' نقطہ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 58)۔

اگر ہم مملکت پاکستان کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے اور اس کی تعلیم کو عام کرتے جاتے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو جاتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم کے رشتے' امت واحدہ ہونے کے اصول و نظریہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وطن اور نسل کی تفریق کے تصور کو عام ہونے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ تشتت و افتراق تھا۔

''ایمان' ایمان خدا پر' ایمان اپنے آپ پر' ایمان اپنے مستقبل پر'' یہ تھی وہ اساسِ محکم جس پر مملکت پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ارباب بصیرت سے کہ سیکولر سٹیٹ کا مدعی کیا اس قسم کے نظریات پیش کرے گا؟ اس موضوع پر کہنے کو تو ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے اور طلوع اسلام گذشتہ نصف صدی سے اس پر لکھتا چلا آ رہا ہے..... لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امریکی منسٹر پادری جورائٹ 'JOE WRIGHT'

کی دعا سینٹ سے خطاب کرتے ہوئے:

اے ہمارے آسمانی باپ! آج ہم تیری بارگاہ میں معافی اور مغفرت طلب کرنے آئے ہیں اور تجھ سے صحیح سمت اور راہنمائی کی التجا کرتے ہیں۔

ہم تیرے الفاظ جانتے ہیں ''سخت تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو بدی کو اچھا کہتے ہیں''۔ لیکن یہی حرکت ہے' بالکل یہی حرکت جو ہم نے کی ہے۔

ہاں! ہماری حکومت میں وہ لوگ ہیں جو برائی کو بھلائی کہہ کر ہمیں گمراہ کر چکے ہیں۔

ہمارا روحانی توازن بگڑ چکا ہے اور ہم نے سب اخلاقی قدروں کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ اے آسمانی باپ! ہم ان جرائم کا اعتراف کرتے ہیں اور تجھ سے مدد کی درخواست کرتے ہیں کہ حالات بدل جائیں۔ ہم نے تیری کھری سچائی کا مذاق اڑایا ہے۔ تیرے کلام کو رسوا کیا ہے۔ ہم نے عیسائیت اور یہودیت کے گٹھ جوڑ کو اجتماعیت کا نام دے دیا ہے۔ ہم نے اس طرح برائی کو بھلائی اور بدی کو خوبی کہہ کر سچائی کے نام پر بٹہ لگایا ہے۔

ہم نے غریب کو لوٹا ہے اور اس کا نام لاٹری رکھ دیا ہے۔ ہم نے آرام طلبی کو نوازا ہے اور اسے ویلفیئر کا نام دے دیا ہے۔

ہم نے اپنے ان بچوں کو قتل کیا ہے جو پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور پھر اسے آزادئ افکار کا نام دیا ہے۔ اور ہم نے لاکھوں عراقی بچے ایسے قتل کئے ہیں جو پیدا ہو چکے تھے اور وہ جو پیدا نہیں ہوئے تھے۔ پھر ہماری سابق وزیر خارجہ البرائیٹ نے اس جرم کو نسل کشی کہنے کی بجائے ''ضرورت'' قرار دیا ہے۔

عراق میں جرائم کو جارج بش سینیئر نے ''خدا کا کام نمٹانا'' کہا ہے۔

ہم اپنے دلوں میں خوب جانتے ہیں اے آسمانی باپ! کہ تجھے اپنے کام نمٹانے کے لئے کسی جاہل انسان کی ضرورت نہیں۔

ہم نے اسقاطِ حمل کی حمایت کرنے والوں کو شوٹ کیا ہے اور اس جرم کو مناسب سمجھا ہے۔

ہم نے اپنے بچوں کو اچھی تربیت نہ دے کر انہیں نظر انداز کیا ہے اور پھر کہا ہے کہ اس طرح ان میں اعتماد پیدا

ہوتا ہے اور وہ اپنی نگاہ میں خوشنما لگنے لگتے ہیں۔

اے خداوند! ہم نے قوت کا بے دریغ اور غلط استعمال کیا ہے اور پھر اسے سیاست کا نام دے دیا ہے۔

انسانیت کے خلاف جتنے جرائم ہیں ان میں ہم ملکوں سے تعصب برتتے آئے ہیں۔ جو بات ایک ملک میں بری ہے اسی حرکت کو ہم دوسرے ملک میں اچھا کہتے ہیں۔

فادر! ہم نے انسانیت کے خلاف خود اپنے کیئے ہوئے جرائم سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ ہماری نگاہیں دوسرے ملکوں کے مال و اسباب پر لگی رہتی ہیں اور پھر ہم اسے قومی جذبے کا نام دیتے ہیں۔

ہم نے امریکی عوام ٹیکس دینے والے عوام' ہر مذہب کے عوام کو لُوٹا ہے تاکہ کسی حقدار قوم کی زمین کو قتل' دھوکے' حرص و لالچ سے حاصل کر لیا جائے۔

ہماری حکومت نے نسل پرستی اور اسرائیل کی ظالمانہ حرکتوں میں امریکی عوام کا پیسہ شامل کر کے ہم سب کو تیری بارگاہ میں مجرم بنا رکھا ہے۔ اور جب ہم یہ سب کچھ کر گزرتے ہیں تو ایک بار پھر خم ٹھونک کر بدی کو اچھا کہتے ہیں اور بارہا ہم نے یہ کہا ہے کہ اے خدا! یہ سب تو نے کیا۔

ہم نے بے حیائی کے غبار سے فضا کو آلودہ کر رکھا ہے اور پھر ہم اسے آزادی کہتے ہیں۔ برائی کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو اینٹی فلاں' اینٹی فلاں کہہ کر ہم دبا دیتے ہیں۔

ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے محترم آباؤاجداد کی کریمانہ اخلاقی اقدار کو پامال کیا ہے۔ جارج واشنگٹن نے ہمیں تنبیہہ کی تھی کہ کبھی دوسری حکومتوں کے معاملات میں دخل نہ دینا لیکن ہم نے یہی کیا ہے اور اسے نئی روشنی' نئے نظام کا نام دے دیا ہے۔

خداوند! اوہ! ہم میں تو اتنی بھی سکت نہیں رہی کہ ہم راستہ تلاش کر سکیں۔ اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ ہم خود کو ڈھونڈ سکیں۔ اے خداوند! تو ہمیں ڈھونڈ لے۔ ہمارے دلوں کو تو آج بھی جانتا ہے۔ تو ان کی تلاشی لے اور ہر گناہ سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے۔ ہمیں ان گناہوں سے آزاد کر دے جو ہماری حکومت نے اپنی گندی پالیسیوں کے نام پر کئے ہیں۔ ان ظالموں نے ہمیں مجرم بنا ڈالا ہے۔ انسانیت کے مجرم!

اے آسمانی باپ! تو راہ دکھا۔ کرم کر ان حضرات پر اور خواتین پر جنہیں تو نے آج میرا لیکچر سننے کے لئے آج بھیجا ہے

ہمیں وہ راستہ دکھا دے جو تیری رضا کی طرف جاتا ہے اور ہمارے لیڈروں کو اتنی توفیق دے کہ وہ سیاسی ناانصافیوں' سفارشوں اور رشوتوں کو ٹھکرا سکیں۔

یہ کہتے ہیں کہ اسرائیل ہمارا دوست اور حمایتی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی واحد جمہوریت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں زہر کا یہ جام بھی پلایا گیا ہے کہ تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ہم مسیحی اور وہ یہودی بہت قریب ہیں۔ یہ وہ زہر ہے جس نے ہمیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ ہم یہود کے برپا کئے ہوئے مظالم دیکھ ہی نہیں سکتے۔

میں جارج بش سینیئر اور جارج بش جونیئر اور ان کی حکومتوں سے پوچھتا ہوں۔ کیا کوئی سچی جمہوریت ایسی ہو

سکتی ہے جو لوگوں پر محض اس لئے مظالم روا رکھے کہ ان کا تعلق ایک اور مذہب سے ہے یعنی اسلام سے؟

میں ان سے یہ بھی پوچھتا ہوں کیا کوئی دوست اتحادی ایسا بھی ہوسکتا ہے جو ہمارے ملک میں اپنے جاسوس چھوڑے اور اس کے بعد انہیں انعامات' خطابات اور مال و زر سے نوازے۔ کیا اسرائیل کے ان گنت جاسوس آج بھی ہمارے ملک میں برسرکار نہیں ہیں؟

صاحبو! یہ تھی منسٹر ریورینڈ ''جورائٹ'' کی مختصر تقریر۔ اس دعائیہ تقریر کے دوران اکثر یہودی کانگرس مین اور سینیٹرز واک آؤٹ کر گئے۔ چند دنوں میں منسٹر پادری صاحب کے دفتر کو پانچ ہزار ٹیلی فون کالیں موصول ہوئیں۔ ان پانچ ہزار کالوں میں جو ان کے دفتر کے ریکارڈ پر موجود ہیں' (4,953) چار ہزار نوسو ترپن کالیں گرم جوش حمایت پر مشتمل تھیں اور صرف 47 کالیں ایسی تھیں جن میں جنابِ رائٹ سے اختلاف کیا گیا۔ اس دعائیہ تقریر کی کاپیاں حاصل کرنے کے لئے دنیا کے ہر ملک سے درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔

اب چلتے چلتے جناب جورائٹ کی تقریر کا آخری جملہ بھی سن لیجئے۔

''اے ہمارے آقا! ہم تجھ سے دعا کرتے ہیں' التجا کرتے ہیں کہ میرے دل سے نکلی ہوئی یہ آہ' یہ پکار ہماری قوم کے ہر فرد تک پہنچے۔ ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم ایک بار پھر کہہ سکیں کہ امریکہ ہے ایک قوم خدا کے تحت''۔

"One Nation Under God"

ترجمہ: ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرشید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر شبیر احمد بن عبدالرشید

قوموں کی ہلاکت

مادہ (ھ ل ک)

ھلاک کے بنیادی معنی ٹوٹنے اور گر پڑنے یا مر جانے کے ہیں۔ نیز عذابِ خوف اور ناداری کے بھی ہیں۔ سرمایہ داری کا غلط نظام ہو تو کوئی قوم تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ تباہی کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ قوم دنیا میں ذلت وخواری کی زندگی بسر کرے قرآن کریم میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قدیم زمانہ میں کوئی بستی کسی طبعی حادثہ مثلاً زلزلہ یا کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے بالکل تباہ ہوگئی ہو۔ لیکن عام طور پر قوموں کی تباہی یا ہلاکت سے مراد ان کی دولت و رسوائی اور کمزوری ومحکومی ہوتی ہے۔ یعنی اگر کسی قوم سے سروری و سرفرازی چھن جائے تو وہ اس کی ہلاکت ہوتی ہے خدا کسی قوم پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ قومیں خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کرتی ہیں اور ہلاک ہو جاتی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کے رسول انکے پاس روشن نشانیاں لائے اور اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا۔ ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے اور ہلاک ہو جاتے تھے (سورۃ روم، ۹/۲۰)۔

ایک دوسری جگہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا تو ان میں کسی پر ہم نے پتھراؤ بھیجا اور ان میں کسی کو چنگھاڑ نے آ لیا۔ کسی کو زمین میں دھنسا دیا اور ان میں کسی کو ڈبو دیا اور اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظُلم کرے۔ ہاں وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے سورۃ المقر میں اس بات کی مزید وضاحت کر دی کہ اپنے جذبات کا اتباع کرتے جانا اور ان پر مستقل اقدار کی پابندی عائد نہ کرنا باعث ہلاکت ہے۔ (۵۴/۳)۔

لہٰذا اسی نظریہ زندگی یا اسی نظام حیات کو ایسے تغیرات سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ جو انا دامن ان مستقل اقدار کے ساتھ باندھ لے۔ جو قوم ایسا نہیں کرتی۔ اس کا غلبہ، تسلط اور قوت و اثر آہستہ آہستہ ضائع ہوتا رہتا ہے اور ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔

قرآنی آیات۔ موضوعات کی ترتیب

قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد وہ نظریۂ زندگی ہوتا ہے جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتی ہے۔ ایک مثبت اور متوازن نظریہ حیات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عمدہ تناور

درخت۔ جڑیں اس کی پاتال میں مضبوط اور شاخیں فضاؤں میں بلند۔ ہمیشہ اللہ کے قانون کے مطابق۔ دیکھو اللہ کس طرح فطری حقائق کو انسانوں کے لئے محسوس مثالوں میں بیان کر دیتا ہے۔ تاکہ سوچ بچار سے کام لیں اور ایک ناقص نظریہ حیات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ناقص اور نکما درخت۔ جڑیں اس کی زمین کے اوپر ہی اوپر اکھاڑ پھینکنے جانے والا۔ استقرار و استحکام سے محروم۔ اس طرح اللہ اہل ایمان کو ثبات و تمکن عطا کرتا ہے۔ اپنے محکم نظام زندگی کے ذریعہ سے۔ دنیاوی زندگی میں بھی اور اخروی زندگی میں بھی۔ اور ان لوگوں پر اللہ کی راہ گم ہو جاتی ہے۔ جو معاملات کو انکا صحیح مقام نہیں دیتے۔'' (۱۴/۲۴۔۲۷)۔

اللہ چاہتا ہے کہ زندہ رہنے والی قومیں بھی کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہیں اور ہلاک ہونے والی بھی دلیل کے ساتھ ہلاک ہوں۔ اللہ چاہتا ہے کہ جس نے ہلاک ہونا ہے۔ وہ بھی کھلی دلیل کے ساتھ ہلاک ہو۔ اور جس نے زندہ رہنا ہے۔ وہ بھی کھلی دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔'' (۸/۴۱)۔

اللہ ایسا نہیں کہ قوموں کو ظلم اور دھاندلی سے زوال کی طرف لے جائے۔ دیکھو تمہارا پروردگار ایسا نہیں کہ۔ ملکوں اور قوموں کو ہلاکت میں ڈال دے یا ان پر زوال لے آئے۔ یونہی اندھا دھند ظلم اور زیادتی سے۔ حالانکہ وہاں کے لوگ معاشرہ کی اصلاح کرنے اور سنوارنے والے ہوں۔'' (۱۱/۱۱۷)۔

اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لے۔ انسان کے آگے اور پیچھے ایسی قوتیں متعین ہیں۔ جو اس کے ہر عمل کو نتیجہ تک پہنچاتی ہیں۔ اور یوں انسان کا ہر عمل اللہ کے قانون کے مطابق محفوظ ہو جاتی ہے۔ دیکھو اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر تبدیلی پیدا نہ کر لے۔ اور جب کسی قوم پر اس کے اعمال کے نتیجہ کے مطابق مصیبت اور تباہی آتی ہے۔ تو پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ اور نظام خداوندی کے سوا کہیں سے اسے مدد نہیں مل سکتی۔'' (۱۳/۱۱)۔

اور اللہ کا نظام کسی خاص قوم کا محتاج نہیں۔ دیکھو قوموں کے درجات ان کے اعمال کی رو سے متعین ہوتے ہیں۔ اور اللہ کا قانون مکافات کسی عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ اللہ کا نظام کسی خاص قوم کا محتاج نہیں کہ اسی کے ہاتھوں قائم ہو۔ اللہ اپنی مہربانی سے ہر قوم کو مواقع پہنچاتا رہتا ہے۔ اگر تم نے ان موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ تو تمہیں زندہ قوموں کی صف سے نکال دیا جائے گا۔ اور تمہارا مقام کسی اور قوم کے حصہ میں آ جائے گا۔ ہمارے قانون مشیت کے مطابق۔'' (۶/۱۳۲۔۱۳۳)۔

قوموں کے اسباب زوال معلوم کرنے کے لئے تاریخ کا مطالعہ کرو تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو تمہارے اردگرد کس قدر قومیں تھیں جو ہلاکت میں پڑ گئیں ج ہم ان تاریخی یادداشتوں کو اس لئے بار بار دہراتے ہیں تاکہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف رجوع کریں۔'' (۴۶/۲۷)۔

تاریخ عالم سے مجرم قوموں کا حال پوچھو۔ تاریخ عالم پر غور کرو اور دیکھو کہ کیا پہلی قوموں پر ان کی غلط روش کی

وجہ سے زوال نہیں آیا۔ پھران کے بعد دوسری قومیں آئیں۔ اور جب انہوں نے بھی ویسا ہی طرزعمل اختیار کیا تو کیا ان کا انجام بھی ویسا ہی نہیں ہوا۔ یہ بات کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں تھی۔ مجرم قوموں کا انجام ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ (۱۷۔۱۶/۷۷)۔

غلط نظام زندگی کے ہاتھوں ہلاکت۔ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ۔قبل ازیں کتنی قومیں ہلاکت میں پڑ چکی ہیں۔ جنہیں دنیا میں اس قدر ثروت اور سطوت حاصل تھی جو انہیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی۔ اور معاشی خوشحالیوں کی نہریں بہتی تھیں۔لیکن وہ اپنے غلط نظام زندگی کی وجہ سے ہلاکت میں پڑ گئیں۔ اور ان کے بعد ان کا مقام و مرتبہ۔ دوسری قوموں کے حصہ میں آ گیا۔'' (۶/۶)۔

مفاد عاجلہ کے پیچھے بھاگنے والی قوموں کی ہلاکت۔ دیکھو نوح کے بعد کتنی ہی قومیں تھیں جو ہمارے قانون مکافات کے مطابق ہلاک ہو گئیں۔اور تمہارے پروردگار کا قانون مکافات کافی ہے۔ اپنے بندوں کے جرائم کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لئے۔ وہ ہر بات سے باخبر ہے۔ اور سب کچھ دیکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو قومیں مفاد عاجلہ کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ انہیں ان کی خواہش کے مطابق عاجلانہ مفادات حاصل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قانون مشیت کے مطابق۔لیکن انجام کار ایسی قوموں کے لئے تباہی کا جہنم ہوتا ہے۔جس میں وہ داخل ہوتی ہیں۔ بدحال اور دھتکاری ہوئی۔'' (۱۸۔۱۷/۱۷)۔

ظالم قوموں کی ہلاکت

تاریخ عالم کو دیکھو کہ کتنی ہی آبادیاں تھیں جنہیں ہمارے قانون مکافات نے گرفت میں لے کر تباہ کر دیا۔اس لئے کہ انہوں نے ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ ایسی اجڑیں کہ ان کی عمارتیں چھتوں پر اوندھی پڑی تھیں۔ان کے کنویں بے کار ہو گئیں۔ اور ان کے قلعے اور محلات کھنڈرات بن کر رہ گئے۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں گھوم پھر کر ایسے مقامات دیکھے نہیں تا کہ اس سے حیرت حاصل کرتے۔اور ان کے دلوں میں عقل وفکر سے کام لینے کی قابلیت اور ان کے کانوں میں بات سننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔حقیقت یہ ہے کہ ماتھے والی آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔ بلکہ قلوب اور ذہن اندھے ہو جاتے ہیں۔ جو انسانی صدور میں ہیں۔'' (۲۲/۴۵۔۴۶)۔

ظلم وسرکشی کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والی قومیں

اور اس کے قانون مکافات کے مطابق ہلاکت میں پڑے عاد اول اور قوم ثمود کے لوگ۔ یہ قومیں ایسی تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا۔ اور ان سے پہلے قوم نوح تباہ ہوئی۔ یہ قومیں اس لئے نیست و نابود ہوئیں کہ ظلم کرتی تھیں اور قانون خداوندی سے سرکش ہو گئی تھیں۔'' (۵۳/۵۰۔۵۲)۔

ظالمانہ روش کے ہاتھوں ہلاکت

کتنی ہی قومیں ہلاکت میں پڑیں۔تم سے قبل اپنی ظالمانہ روش کے ہاتھوں۔'' (۱۰/۱۳)۔

یہ ان آبادیوں کے آثار ہیں۔ جو ہمارے قانون

مکافات کے مطابق ہلاک ہوگئیں۔ اپنی ظالمانہ روش کی وجہ سے۔'' (۱۸/۵۹)۔

ظلم ہی قوموں کی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے۔ ہم کسی قوم کو ہلاکت میں نہیں ڈالتے۔ بجز اس کے کہ اس کے افراد نے ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی ہو۔'' (۲۸/۵۹)۔

سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مفاد پرستی وجہ زوال و ہلاکت ہو۔ ہمارے قانون مکافات کی رو سے۔ کسی ملک و قوم پر ہلاکت یا زوال اس وقت آتا ہے۔ جب وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی اہل اور مفاد پرست ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح نظام خداوندی کی حدود سے باہر نکل جاتی ہیں۔ تو ہلاکت وزوال اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی بیخ کنی کر دی جاتی ہے۔'' (۱۷/۱۶)۔

جرائم میں ملوث اقوام ہلاکت میں پڑ جاتی ہیں۔ ہمارے قانون مکافات کے مطابق جو قومیں ہلاک ہوئیں وہ جرائم میں ملوث تھیں۔'' (۴۴/۳۷)۔

سرکش و حدود فراموش ہلاکت کا سبب۔ ہمارے قانون مکافات کی رو سے وہ قومیں ہلاک ہوئیں۔ جنہوں نے سرکشی اور حدود فراموش اختیار کر رکھی تھی۔'' (۲۱/۹)۔

نظام خداوندی کی حدود سے باہر نکل جانے کا نتیجہ ہلاکت۔ ہلاکت میں وہی قومیں پڑتی ہیں۔ جو نظام خداوندی کی حدود سے باہر نکل جاتی ہیں۔'' (۴۶/۳۵)۔

اگر نظام خداوندی سے روگردانی کرو گے تو اپنا مقام کھو بیٹھو گے دیکھو تم لوگوں کو دعوت دی جاری ہے کہ قیام و استحکام نظام خداوندی کے لئے اپنے اموال وقف کر دو۔ یاد رکھو اس سلسلہ میں جو کوئی بخل سے کام لیتا ہے۔ اللہ تو غنی ہے۔ اسے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ سب کچھ تمہاری محتاجیاں دور کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ بہرحال اگر نظام خداوندی سے روگردانی کرو گے۔ تو تمہارا یہ مقام کسی اور قوم کے حصہ میں آ جائے گا۔ جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔'' (۴۷/۳۸)۔

معاشرہ میں حسن وتناسب نہ قائم کرنے والی قومیں ہلاک ہو جاتی ہے۔ دیکھو قیام واستحکام نظام خداوندی کی راہ میں اپنے اموال خرچ کر دو۔ اور اگر ایسا نہ کرو گے تو اپنے ہی ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لو گے۔ حسن وتوازن پیدا کرو۔ اس نظام کے لئے اپنے معاشرہ میں۔ بلاشبہ اللہ حسن و توازن پیدا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (۲/۱۹۵)۔

مادی نظریہ حیات کی بنیاد علم پر نہیں ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ یہیں ہمارا مرنا اور جینا ہے۔ اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ دیکھو ان کا یہ نظریہ علم پر مبنی نہیں ہے۔ یہ لوگ محض گمان و قیاس کی بنا پر ایسی باتیں کرتے ہیں۔'' (۴۵/۲۴)۔

قوموں پر زوال بتدریج آتا ہے۔ جو لوگ ہمارے قوانین کو جھٹلاتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ بتدریج تباہی کے مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس کا انہیں وہم گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور یہی ان کے لئے مہلت کا وقفہ ہے۔ بلاشبہ ہمارے قانون مکافات کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔'' (۷/۱۸۲)۔

قوموں کی ہلاکت میں وقفۂ مہلت۔ ہمارے قانون مکافات کی رو سے اس وقت تک ہلاکت نہیں آتی کسی قوم یا علاقہ کے لوگوں پر۔ جب تک ان کا وقفۂ مہلت پورا نہیں ہو جاتا۔ کوئی قوم نہ اس وقفۂ مہلت سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے اور نہ اس وقفہ کے بعد چھوٹ ہی سکتی ہے۔'' (۵۔۴/۱۵)۔

قوموں پر ہلاکت اس وقت آتی ہے جب ان میں واپسی کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ قومیں مستحق قرار پا جاتی ہیں۔ ہمارے قانون کے مطابق ہلاکت کی۔ جب ان میں رجعت الی اللہ کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔'' (۹۵/۲۱)۔

اور پھر ظالم قومیں خس و خاشاک کی طرح پامال ہو جاتی ہیں۔ اور پھر ہمارے قانون مکافات نے انہیں خس و خاشاک کی مانند پامال کر دیا۔ اور وہ زندگی کی کامرانیوں و خوشگواریوں سے دور ہو گئے۔ یہ انجام ہے ظالم قوموں کا۔'' (۲۳/۴۱)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لیفٹیننٹ کرنل محمد ایوب خان

مسئلہ نفاذِ اسلام

میں آپ کی توجہ نفاذِ قانونِ اسلام کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور ایک ٹھوس تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے لئے بنایا گیا۔ لیکن یہ قول درست نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام پہلے دن نافذ ہو جاتا۔ انگریز نے 1858ء میں ''محمڈن لاء'' کو منسوخ کر کے اپنا قانون نافذ کیا۔ اسی طرح 1947ء میں انگریزی قانون کو منسوخ کر کے ''محمڈن لاء'' نافذ کر دیا جاتا۔ پاکستان دراصل اس ''جمہوری اکثریت کی حکومت'' کے زمانے میں مسلمانوں کی حفاظت کی ایک تجویز تھی کہ کل ہند میں ہندو کی حکومت ہو گی اس لئے مسلمان اکثریت کے علاقوں کو الگ کر لیا جائے۔ اس میں خامی یہ تھی کہ نصف مسلمان بھارت میں رہ گئے اور بیکسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ بہرحال یہ ہوا اور ایک مسلمان ملک وجود میں آ گیا۔

پاکستان کے کرتا دھرتا تو انگریزی تعلیم، تخیل اور قانون کے پروردہ تھے۔ وہ اسی پر راضی رہے اور ذاتی مفاد میں اسے بھی خراب کرتے رہے۔ اسلام کے لئے راہنمائی علماء نے کرنا تھی مگر وہ بھی نہ کر سکے۔ ان کے ذہن بھی دوسو سالہ غلامی میں انگریزی تخیل سے ماؤف ہو چکے تھے۔ اکثر صرف نماز کی امامت یا جمعہ کا خطبہ بطور پیشہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کچھ علماء جمع ہوئے اور انہوں نے قرارداد مقاصد بنائی۔ لیکن اس کا مقام اتنا ہی تھا جتنا کسی کو مسلمان کرتے وقت کلمۂ شہادت پڑھانے کا ہوتا ہے اور عمل کی باری نہیں آتی۔ پھر شور ہوتا رہا کہ قرآن وسنت کو نافذ کیا جائے یا یہ کیا گیا کہ خلاف اسلام قانون نہ بنایا جائے۔ اس میں یہ مفروضہ شامل تھا کہ یہاں اسلام نافذ ہے آئندہ کوئی قانون اس کے خلاف نہ ہو حالانکہ یہاں سرے سے اسلام مفقود تھا۔

صدر ایوب کے زمانے میں شور ہوا تو اس نے وقت کو ٹالنے کے لئے اسلامی نظریاتی کونسل بنا دی کہ وہ بتائے کہ اسلام کیا ہے اور وہ آج تک ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ پھر ضیاء الحق آئے اور اسلام نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ تعزیرات کا قانون بنایا اور وہ اس طرح کہ آج تک کسی کو قرآنی سزا نہ ہوئی اور جرائم دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ زکوٰۃ کا قانون بنایا اور اس طرح کہ وہ فقراء تک نہیں پہنچتی اور وہ چوری اور ڈاکوں پر گزر کر رہے ہیں۔ قتل کے لئے دیت کا قانون بنایا اور وہ اس طرح کہ ایسے مجرم کو دس دس سال تک جیل میں سڑتے ہیں۔ شریعت کورٹ بنائی

اورس کے خلاف فیصلہ کرنے کا حق ''غیر شرعی'' سپریم کورٹ کو دے دیا اور مزا یہ کہ ان باتوں کے خلاف علماء نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ میں نے اس زمانے میں تعزیرات کے قانون کے خلاف مضمون لکھا تھا اور اب دیت کے قیدیوں کی رہائی کا حکم میرے کھ کی وجہ سے ہوا۔ مرضی سے نکاح کرنے والوں کے جواز کا فیصلہ میری وجہ سے ہوا جب میں نے امام ابوحنیفہؒ کا یہ فیصلہ پیش کیا کہ اگر ولی کے بغیر نکاح ہو گیا تو ہو گیا اسے فسخ نہیں کیا جائے گا۔

جس بات کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام دنیا میں پاکستان کے ساتھ نہیں آیا بلکہ چودہ سو سال سے موجود ہے۔ اس کا قانون (فقہ) دوسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی اور مسلمان سلطنتوں کا قانون بنا۔ ہندوستان میں فقہ حنفی قانون تھا۔ خوش قسمتی سے اورنگ زیب کے حکم سے اسے فتاویٰ عالمگیری کی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ وہ فتاویٰ آج بھی موجود ہیں۔ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مکمل طور پر فوراً نافذ کیا جائے اور نفاذ کے بعد جہاں ضرورت پیش آئے علماء کی ایک مجلس اس میں ترمیم کرے۔

تجویز یہ ہے کہ فقہ حنفی کے چند جید غیر سیاسی علماء کی ایک مجلس بنائی جائے جو علمی رنگ میں اس کی جدوجہد کرے۔ کیا آپ ایسا کریں گے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وزیر محمد جعفر، کامونکی

عورت قرآن کی نظر میں

۸ مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کی مناسبت سے دنیا بھر میں سیمینارز، کنونشن اور کانفرنسیں منعقد کی جاتی ہیں تاکہ خواتین کے حقوق اور حفاظت و سلامتی کے لئے معاشرتی قوتوں کو متحد کیا جائے اور ارباب حل وعقد کو اس ضمن میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جائے۔

قارئین! آیئے ہم دیکھیں کہ دین اسلام نے عورت کو کون سا مقام بلند عطا کیا ہے اور ساتھ ہی ان باطل تصورات کی حقیقت معلوم کریں جو کہ معاشرہ میں عام مشہور ہیں، یہ کہ عورت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی اس لئے یہ پسلی کی ہڈی کی طرح ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی اگر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ آدمؑ کو جنت سے نکلوانے کا سبب عورت ہی تھی۔ عورت ناقص العقل ہے اس لئے اس کی آدھی گواہی ہے۔ خاوند اپنی بیوی کی بغرض اصلاح پٹائی بھی کرسکتا ہے جس قوم کے امور زندگی میں عورت کی رائے کو دخل ہوگا وہ قوم تباہ ہوجائے گی، عورت کو گھر ہی میں رہنا چاہئے وغیرہ ذالک۔

قرآن کریم نے سب سے پہلے اس باطل تصور کی تردید کی کہ اللہ نے پہلے مرد (آدمؑ) کو پیدا کیا تھا اور اس کی پسلی سے عورت (حواؑ) نکالی تھی۔ قرآن نے کہا کہ مرد اور عورت ایک اصل کی دو شاخیں ہیں اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ان میں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں فرمایا: ''اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو نفس واحدہ سے پیدا کیا اور اس کے جوڑے بنائے۔'' (۱۸۹/۷) ایک دوسرے مقام پر کہا: ''تم سب (مرد اور عورت) ایک دوسرے میں سے ہو (ایک دوسرے کے جزو ہو) (۱۹۵/۳)۔ اس کے بعد قرآن نے اس عقیدے کی تردید کی کہ جنت میں آدمؑ کی لغزش کا موجب عورت ہوئی تھی۔ قرآن نے کہا کہ مرد اور عورت دونوں میں یکساں طور پر قانون کی پابندی اور قانون شکنی کی صلاحیت موجود ہے۔ فرمایا: ''شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا''۔ (۳۶/۲)۔

اس لئے یہ سمجھنا غلط ہے کہ دنیا میں گناہ کی ذمہ داری عورت پر ہے مرد بالکل معصوم ہے۔ پھر فرمایا: ''تم میں سے کوئی مرد ہو یا عورت، میں کسی کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا'' (۱۹۵/۳) تقسیم کار کے فرق کو چھوڑ کر باقی تمام انسانی صلاحیتیں مرد اور عورت دونوں میں موجود ہیں۔

''عورت ناقص العقل ہے، اس کی آدھی گواہی ہے

اس بات کو ثابت کرنے کے لئے سورہ بقرہ کی آیت نمبر۲۸۲ پیش کی جاتی ہے جبکہ قرآن کریم نے دوعورتوں کی ضرورت کے متعلق خود ہی بات واضح کر دی ہے یہ کہ اگر ایک عورت Confused ہو جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ اس زمانے میں عورتوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ (جہالت کی وجہ سے) دوسرے کا تو ایک طرف خود اپنا معاملہ بھی وضاحت سے بیان نہیں کر سکتی تھی (۱۸/۴۳)۔اور چونکہ انہیں اجتماعی امور میں حصہ لینے کے مواقع نہیں دیئے جاتے تھے اس لئے عدالت کے سامنے ان کا پریشان ہو جانا کچھ مستعبد نہیں تھا۔

(۲) دوسری عورت کی ضرورت اس وقت لاحق ہوتی تھی جب پہلی عورت کچھ بھول جائے یا اسے الجھاؤ پیدا ہو جائے اگر پہلی عورت کی یہ حالت نہ ہوتو پھر نہ دوسری عورت دخل دے سکتی ہے نہ اس کی گواہی کی ضرورت پڑتی ہے۔اس سے واضح ہے کہ ایک مرد کے عوض دو عورتیں بطور گواہ پیش نہیں ہوتی تھیں بلکہ گواہی ایک ہی کی کافی سمجھی جاتی تھی بشرطیکہ وہ عدالت میں آ کر گھبرا نہ جائے۔ (بحوالہ قرآنی قوانین)

اس سے ظاہر ہے کہ عورت کو محض عورت ہونے کی جہت سے مردوں کے مقابلہ میں ناقص الاعتبار قرار نہیں دیا گیا۔صرف عورت کی اس مخصوص حالت کو ملحوظ رکھا گیا ہے اگر وہ حالات نہ رہیں تو ایک عورت کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر تسلیم کی جائے گی۔

''خاوند اپنی بیوی کی پٹائی کر سکتا ہے'' اس باطل تصور کو ثابت کرنے کے لئے سورہ نساء کی آیت نمبر۳۴ پیش کی جاتی ہے۔''مرد عورتوں پر حاکم ہیں..... وہ ان کی پٹائی کر سکتے ہیں'' سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس آیت میں میاں بیوی کے متعلق بات نہیں ہو رہی بلکہ الرجال (عام مردوں ۹ اور النساء (عام عورتوں) کے متعلق بات ہو رہی ہے اس لئے یہاں گفتگو یہ ہے کہ معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے فرائض مفوضہ کیا ہیں؟

اس آیت کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ''جہاں تک فطری فرائض کا تعلق ہے مردوں اور عورتوں کی بعض صلاحیتوں میں فرق ہے۔کسی میں مردوں کو برتری حاصل ہے کسی میں عورتوں کو' ان فرائض کی سرانجام دہی کا نتیجہ ہے کہ عورت بیشتر وقت کے لئے کسبِ معاش سے معذور ہو جاتی ہے اور اس کی ضروریات کا کفیل مرد ہوتا ہے۔اس انتظام کے بعد عورتیں اپنے مخصوص فرائض' اولاد کی پیدائش اور پرورش کو اطمینان سے سرانجام دے سکتی ہیں۔لہٰذا انہیں چاہئے کہ اپنی ان مخصوص مضمر صلاحیتوں کی حفاظت کریں لیکن اگر اس کے باوجود یہ صورت پیدا ہو جائے کہ عورتیں بغیر کسی معقول عذر کے ان سے سرکشی اختیار کریں تو یہ انفرادی مسئلہ نہیں رہے گا قوم کا اجتماعی مسئلہ بن جائے گا کیونکہ اس کا تعلق تحفظ و افزائش نسل سے ہے اس کے لئے معاشرہ کو چاہئے کہ عورتوں کو اس کی بابت سمجھایا جائے اگر یہ طریق موثر ثابت نہ ہو تو ان کے خاوندوں کو کہا جائے کہ وہ ان سے تعلقات منقطع کر لیں تاکہ اس نفسیاتی اثر سے اس میں ذہنی تبدیلی پیدا ہو

جائے اور اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو عدالت انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ مسئلہ قوم کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہے اور بڑی اہمیت رکھتا ہے اگر عورتیں اس سلسلہ میں عدم تعاون پر اتر آئیں اور اجتماعی مفاد انسانیت کے خلاف سرکشی برتیں تو معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ازالہ کے لئے موثر اقدامات کرے یہ ایک معاشرتی جرم ہے جس کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ عورتوں کو مارنے پیٹنے پر اتر آئیں کہ وہ ان کے حاکم ہیں اور ان پر داروغہ مقرر کئے گئے ہیں' یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ (بحوالہ قرآنی قوانین)

اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ ''جس قوم کے امور زندگی میں عورت کی رائے کو دخل ہوگا وہ قوم تباہ ہو جائے گی'' جبکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق تو حکومت میں بھی عورت برابر کی شریک ہے' فرمایا! ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں حکومت دیں تو وہ نظام صلوٰۃ قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور معاملات کا انجام تو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے'' (۲۲/۴۱)۔

درج بالا آیات میں جمع مذکر کے صیغے استعمال ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے اس کی وضاحت سورہ توبہ میں کچھ اس طرح کر دی گئی ہے فرمایا! ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حامی ہیں وہ نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں.....'' (۹/۷۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کو علماء بھی کہا ہے۔ فرمایا ''ذرا غور کرو کہ بادلوں سے ایک جیسا پانی برستا ہے لیکن اس سے مختلف انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کا مادہ تخلیق ایک ہی تھا لیکن ان میں مختلف رنگوں کے خطے ہیں' کوئی سفید' کوئی سرخ' کوئی کالا' بھجنگ اسی طرح انسان' دیگر حیوان اور مویشی بھی مختلف قسموں کے ہیں۔ صحیفۂ فطرت کے یہ اوراق جو قوانین خداوندی کی زندہ شہادات ہیں سب کے سامنے کھلے رہتے ہیں لیکن ان قوانین کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان شہادات پر علم و بصیرت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ یہ لوگ علماء کہلانے کے مستحق ہیں اور یہی جان سکتے ہیں کہ خدا کا قانون کس قدر غلبہ کا مالک ہے اور جو اس کے مطابق چلتا ہے وہ اسے کس قدر سامان حفاظت عطا کرتا ہے۔'' (۲۸۔۲۷/۳۵)۔ یہاں پر بھی جمع مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت اگر مومنہ ہے تو وہ امور مملکت میں مرد کے مقابلہ میں برابر کی شریک ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھی نرس' اچھی لیڈی ڈاکٹر' اچھی استانی' اچھی پروفیسر اور اچھی لیڈر بن کر قوم کی بہتر طور پر تربیت کر سکتی ہے۔

عورتوں کے پردہ کے متعلق فرمایا گیا کہ ''اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلیں تو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا لیا کریں جس سے زینت نمایاں نہ ہو یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں.....'' (۳۳/۵۹)۔

جبکہ اس سے پہلے سورہ نور کی آیت نمبر ۳۰ میں مردوں سے کہہ دیا کہ

''مومنوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں.....''۔

اس کے بعد فرمایا ''مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں اور اپنی عفت کی پوری پوری حفاظت کریں ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنی زینت و آرائش کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں جس قدر وہ چلتے پھرتے از خود ظاہر ہو جائیں انہیں اتنا ہی ظاہر ہونے دیں' انہیں خود نمایاں نہ کریں۔ اس کے علاوہ انہیں چاہئے کہ اپنی اوڑھنے کی چادریں اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈال لیا کریں اور چلتے وقت اپنے پاؤں اس زور سے زمین پر نہ ماریں کہ چھپے ہوئے زیورات کی جھنکار سے معلوم ہو جائے کہ انہوں نے کیا پہن رکھا ہے.....'' (۳۱/۳۴)۔

درج بالا قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مومن عورتوں کو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا لینا چاہئے جس سے زینت نمایاں نہ ہو یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جاسکیں کہ شریف زادیاں جارہی ہیں یہ جو ہمارے ہاں عورتیں برقعہ پہنتی ہیں یا آدھا چہرہ ڈھانپتی ہیں یہ کوئی اسلامی پردہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایسا کر کے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔ یہ ثقافتی لباس تو کہلا سکتا ہے کوئی اسلامی لباس نہیں۔ اگر وہ ٹوپی برقعہ' سادہ برقعہ پہنیں یا آدھا چہرہ ڈھانپ کر گھر سے باہر نکلیں تو کسی کو کیا معلوم کہ وہ شریف زادیاں ہیں بھی کہ نہیں۔ اور کس کی ماں ہے؟ بیٹی ہے؟ بہن ہے؟

سورہ احزاب کی آیت نمبر ۶۱۔۶۰ میں واضح طور پر فرما دیا کہ ''منافقین جن کے دلوں میں خباثتیں بھری ہوئی ہیں اور وہ فتنہ پرور جن کا کام ہی معاشرہ میں شرانگیز خبریں پھیلانا ہے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو پھر ان کے خلاف قوت کا استعمال کرنا پڑے گا۔ اس سے یہ لوگ کچھ عرصہ بعد یہاں سے دور ہو جائیں گے اور ان تمام مراعات سے محروم کر دیئے جائیں گے (جو انہیں اسلامی مملکت کے شہری ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں) یہ اس پر بھی اپنی سرکشی سے باز نہ آئیں تو جہاں کہیں بھی ہوں گے انہیں گرفتار کیا جائے گا اور سختی سے قتل کر دیا جائے گا''۔

درج بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ گلیوں' بازاروں' چوراہوں یا کہیں بھی عورتوں کو تنگ کرتے ہیں اور ان کے بارے میں غلط خبریں مشہور کرتے ہیں ان کی کم از کم سزا شہر بدر کرنا ہے یا پھر انتہائی سزا سزائے موت ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت کے حوالے سے اتنی صاف واضح قرآنی تعلیمات اور احکامات کے باوجود یہ باطل تصورات دین کا جزو کیسے بن گئے اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارا مروجہ اسلام یہودیوں کی رسوم پرستی' مجوسیوں کی اشخاص اور نسل پرستی اور عیسائیوں کی خانقاہیت کا مرقع ہے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ حضرت علیؓ زیادہ فتوحات کرنے کے مخالف تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو علاقے فتح ہو چکے ہیں وہاں کے نومسلموں کی

تعلیم و تربیت اسلامی تعلیمات کے مطابق کی جائے تا کہ وہ اسلامی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھ کر اسلامی معاشرے کا موثر رکن ثابت ہوں۔ جبکہ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی نشانیوں میں سے ایک یہ نشانی بتائی ہے کہ ''جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ اس پر بہرے اور اندھے ہو کر گر نہیں پڑتے بلکہ غور و فکر کر کے ان پر ایمان لاتے ہیں۔'' (۲۵/۷۳)۔

ہم نے قرآنی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی ہم غور و فکر کرتے ہیں صرف وضعی روایات و احادیث کو دین سمجھ کر عمل پیرا ہیں۔ اسی لئے نبی ﷺ روز قیامت گلہ کریں گے ''اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا'' (۲۵/۳۰)۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ صرف ان روایات و احادیث کو مانیں اور عمل پیرا ہوں جو قرآنی تعلیمات کے مطابق ہوں اور جو روایات و احادیث یا اقوال صحابہؓ قرآنی تعلیمات کے منافی ہوں تو ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ وضعی ہیں، خود ساختہ ہیں اسلام کے دشمنوں نے اسلام کو بدنام کرنے کے لئے دین میں شامل کر دی ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ معاشرہ میں عورت کو اس کا جائز مقام دیں تا کہ ہمارا معاشرہ صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بن سکے۔

''والسلٰم علیٰ من اتبع الھدیٰ'' (۲۰/۴۷)

(بشکریہ جنگ، 15 نومبر 2002ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لغات القرآن

اخر

آخر (اس کا مونث **آخرة** ہے)۔آخر۔اول کا مقابل ہے۔ **ھو الاول والاخر** (۳/ ۸۷)۔ صاحب محیط کے الفاظ میں یہ ایسی چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو کسی پہلے آنے والی چیز کے بعد آ رہی ہو لیکن اس کے بعد پھر اس جیسی کوئی اور چیز نہ آ رہی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ **آخر** ایک سلسلہ کی آخری کڑی ہوتا ہے۔یعنی اس کے بعد پھر اس جیسی اور کڑیاں نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس زندگی کے بعد دوسری زندگی (**آخرة**) کو خلق جدید سے تعبیر کیا ہے (۹۸، ۴۹/ ۱۷، ۳۲/۱۰) یعنی وہ زندگی، اس موجودہ زندگی کے تسلسل میں (اس سے ملے ہوئے) آئے گی، اس لئے اس لحاظ سے وہ اس کی آخری کڑی ہوگی۔لیکن اس سے موجودہ طبعی زندگی کی کڑیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور ایک نئے انداز کی زندگی آغاز ہوگا۔اس اعتبار سے وہ ایک نئی زندگی کی پہلی کڑی ہوگی۔

اسی طرح قرآنی انقلاب کے بعد انسانوں کی جو تمدنی زندگی شروع ہوتی ہے وہ بھی اگرچہ سابقہ تمدن سے متصل ہی ہوتی ہے لیکن وہ اس تمدن کی آخری کڑی ہوتی ہے۔ اس سے ایک نئے انداز کا انسانی تمدن شروع ہوتا ہے۔

لہٰذا آخرۃ کسی سلسلہ کی آخری کڑی کو کہتے ہیں جس کے بعد نئے سلسلہ کا آغاز ہو۔ **آخیرۃ الرحل**۔ کجاوہ کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں جو **قادمة الرحل** کی ضد ہے۔ **آخرة العین**۔ آنکھ کے اس کوئے کو کہتے ہیں جو رخسار سے متصل ہوتا ہے اور **قادمة العین**۔اس حصے کو جو ناک سے متصل ہوتا ہے

آخر قدم کی ضد ہے (ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی یہی لکھے ہیں)۔قدم کے معنی ہیں آگے ہونا۔لہٰذا **آخر** کے معنی ہیں پیچھے ہونا۔ **تاخر**، **تقدم** کی ضد ہوتا ہے۔ **متقدم** اور **متاخر** کے معنی اس سے واضح ہیں۔ قرآن میں **ماتسبق** کے مقابلہ میں **ما یستاخرون** (۱۵/ ۵) بھی آیا ہے۔ **مستقدمین** کے مقابلہ میں **مستاخرین** بھی (۲۴/ ۱۸)۔

آخر (خا کی زبر کے ساتھ) غیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔یعنی جو دوسرے سے مختلف ہو۔ جیسے رجل

آخر۔ دوسرا آدمی۔ (دوسرے کے معنی (Second) نہیں بلکہ (Another) یا (Other Than) ہیں) اسی طرح اگر ایک لائن میں کچھ آدمی کھڑے ہوں تو پہلے کے بعد دوسرا آدمی اخر ہوگا اور دوسرے کے بعد تیسرا آخر ہوگا۔ اسی طرح یہ سلسلہ اخیر تک چلا جائے گا (اخر کی تانیث اخریٰ ہے جس کی جمع **آخر** ہے (۳/۶)۔

اس کے بعد یہ لفظ **آخر** مغایرت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا (تاج)۔ مغایرت کے معنی ہیں جو اپنی پہلی کڑیوں سے مختلف ہو۔ سورۃ المؤمنون میں اس لفظ کے یہ معانی بڑی عمدگی سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں انسانی پیدائش کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کی ابتدا مٹی کے خلاصے سے ہوئی۔ پھر نطفہ بنا اس سے حمل قرار پایا۔ پھر نطفہ سے لوتھڑا گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہوا۔ پھر اس میں ہڈیاں بنیں۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھا۔ یہاں تک پیدائش کے وہ مراحل ہیں جو قانون طبعی کے مطابق سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی کڑی نہیں آتی جو اس قانون کی رو سے سابقہ کڑی سے الگ ہو۔ (حتیٰ کہ اس منزل تک حیوان کے بچے اور انسانی جنین میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا)۔ اس کے بعد ہے **ثم انشانہ خلقا آخر** (۲۳/۱۴)۔ ''پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی تخلیق میں اٹھا کھڑا کیا''۔ یہاں خلقا آخر کے معنی یہ ہیں کہ سلسلہ تخلیق کی یہ کڑی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس میں انسانی ذات کی طرف اشارہ ہے جو طبعی قوانین کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اسے دور حاضر کی اصطلاح میں فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کہتے ہیں۔ یعنی جس میں اچانک، غیر متوقع طور پر ایک ایسی تخلیق سامنے آجاتی ہے جو اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔

لہٰذا آخر اور آخر کے معانی کے اعتبار سے انسانی زندگی کا یہ تصور سامنے آیا کہ انسانی پیکر میں آکر زندگی نے اپنی سابقہ کڑیوں سے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔ اب یہ سلسلہ اس کی طبعی موت تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد ایک دوسری زندگی ہوگی جو اگرچہ اس زندگی سے بالکل متصل ہوگی لیکن اس سے موجودہ کڑیوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد زندگی ایک نیا اسلوب اختیار کرے گی۔ جو لوگ اس زندگی کے متعلق موجودہ زندگی کے قوانین (Physical Laws) کے مطابق سوچتے ہیں انہیں اس پر یقین پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو دل و دماغ، قدرت کے اچانک انقلابات کی تخلیقی کارفرمائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں وہ آخرت پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آخرت، اس مستقبل کا نام ہے جو انقلاب آفرینی کے ذریعے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ گردش دولابی (کولہو کے بیل کی حرکت) کے ذریعے۔ یہ انقلاب اس زندگی میں (قرآن کے ذریعے) پیدا ہوتا ہے اور موت کے بعد کی زندگی بھی ایک نئے انقلاب سے ظہور میں آتی ہے۔

قرآن **الحیوٰۃ الدنیا** کے مقابل **قیامۃ** اور۔ **آخرۃ** کے الفاظ لاتا ہے۔ مثلاً **خزی فی الحیوۃ الدنیا و یوم القیٰمۃ یردون** ..... (۲/۸۵)۔ اور **اولٰئک الذین اشتروا الحیوۃ الدنیا بالاٰخرۃ** (۲/۸۶)۔ دنیا کے معنی

ہیں قریبی (دیکھئے عنوان د۔ن۔و) اسی طرح وہ **عاجلة** کے مقابلہ میں **آخرة** بھی لاتا ہے۔ مثلاً (۱۹۔۱۸/۱۷)' (۲۱۔۲۰/۷۵) میں۔ یعنی پیش پا افتادہ بمقابلہ مستقبل۔ **آخر الامر**۔ اسی طرح **تعجل** اور **تاخر** بھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں (۲/۲۰۳)۔ نیز **آخرة بقابله اولیٰ** (۷۹/۲۵) بھی۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے' سورۃ حجر میں مستقدمین کے مقابل متاخرین کا لفظ آیا ہے (۲۴/۱۵)۔ یعنی پہلے چلے جانے والے اور بعد میں آنے والے۔ اسی کی تشریح دوسری جگہ **ماتسبق من امة اجلها وما یستاخرون** (۵/۱۵) نے کر دی ہے۔ سورۃ شعراء میں **فی الاخرین** (۸۴/۳۶) کے معنی آنے والی نسلیں ہیں۔

لہٰذا ''آخرت'' کے مفہوم میں' پیش پا افتادہ مفاد کے بجائے مستقبل کی خوشگواریاں' موجودہ نسل کے بجائے آنے والی نسلیں (انسانیت عامہ)' انقلاب آفرینی کے ذریعہ ایک نئی زندگی کی نمود' اور اس طبعی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی کے تصورات' سب شامل ہیں۔

آخر۔ یؤخر۔ کسی کام کو بعد میں کرنا۔ ملتوی کرنا۔ موقوف کرنا **(عن)**۔ مہلت دینا **(الٰی)**۔ تاخر پیچھے رہ جانا۔ دوسرے کے بعد آنا۔ **ومن تعجل فی یومین..... ومن تاخر.....** (۲/۲۰۳)۔ ''اور جو جلدی کر کے دو دن میں (چلا جائے)..... اور جو پیچھے رہ جائے''۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ آخرت (مستقبل) پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مفاد عاجلہ (پیش پا افتادہ مفاد) پر گر نہیں پڑتے بلکہ ہمیشہ اپنے سامنے مستقبل کا مفاد رکھتے ہیں۔ جو کسان بیج کے لئے رکھے ہوئے گیہوں کو چکی میں پسوا کر اس کی نرم نرم روٹیاں کھا لیتا ہے اس کی آج کی بھوک تو مٹ جاتی ہے۔ لیکن مستقبل (آخرت) میں اس کے لئے مستقل بھوک ہوتی ہے۔ لیکن جو کسان اس بیج کو زمین میں ڈال کر چھ سات ماہ تک برابر محنت کرتا ہے اور نہایت ثبات وتحمل سے فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے اس کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے اور جب یہ سلسلہ ایک چکر باندھ لیتا ہے تو اسکا حال بھی خوشگوار ہو جاتا ہے اور مستقبل بھی۔ یہ اس لئے کہ اسے مستقبل (آخرت) پر یقین تھا اس لئے وہ مفاد عاجلہ پر لپک نہیں پڑا۔ غور کیجئے۔ دنیا میں وہی قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے جس کے سامنے مستقبل کی بہبودی ہو۔ مومن کو مستقبل پر یقین رکھنے والا کہا گیا تھا۔ لیکن آج اس آسمان کے نیچے جماعت مومنین (مسلمان) سب سے زیادہ عاقبت فراموش (مستقبل سے بے نیاز) ہے اور اس لئے سب سے پیچھے۔ حالانکہ اس کا مستقبل اس قدر محدود فراموش تھا کہ اس کا احاطہ اس دنیا کی چار دیواریوں تک محدود نہیں تھا۔ وہ موت کے بعد بھی برابر آگے چلتا تھا۔

واضح رہے کہ ایک فرد کی زندگی میں ہر آنے والا سانس مستقبل ہے۔ ایک قوم کی زندگی میں آنے والی نسل اس کا مستقبل ہے۔ نوع انسانی کے لئے آنے والے زمانے کی انسانیت (Humanity) اس کا مستقبل ہے' اور ان سب کے لئے اس دنیا کی طبعی زندگی کے بعد' اگلی زندگی (حیات

آخرت) مستقبل ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ جب قرآن کریم نے مفاد عاجلہ کے مقابلے میں آخرت پر یقین رکھنے کی تاکید کی تھی تو اس کا مفہوم کیا تھا؟ یہی کہ فرد ہو یا قوم۔ وہ

(۱) صرف اپنے حال ہی کو نہ دیکھے۔ مستقبل پر بھی نگاہ رکھے۔

(۲) موجودہ نسل کی بہبود ہی پر قناعت نہ کرے۔ آنے والی نسلوں کی خوش حالی کو بھی پیش نظر رکھے۔ اور

(۳) زندگی اس دنیا کی طبیعی زندگی کو نہ سمجھ لے۔ موت کے بعد کی زندگی پر بھی یقین رکھے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر فتح محمد ملک

علامہ اقبالؒ اور پنڈت نہرو

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ تصورِ پاکستان کی تردید اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں جو سوالات 1940ء سے لے کر سن 1947ء تک اٹھائے گئے تھے اور تحریکِ پاکستان کے دوران جن کی بڑی مؤثر اور محکم تردید کر دی گئی تھی وہی سوالات آج پاکستان میں پھر سے اٹھائے جا رہے ہیں۔ یومِ اقبالؒ کی مناسبت سے منعقد ہونے والی تقریبات میں پنڈت نہرو کے اس الزام کی گونج ایک دفعہ پھر سنائی دی کہ اقبال اپنی زندگی کے دورِ آخر میں سوشلزم کے زیرِ اثر تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے۔ رزنامہ ''ڈان'' (۸ مئی ۲۰۰۲ء) کے ایک مراسلہ نگار' جناب نثار حسین نے مجھ سے یہ تقاضا کیا ہے کہ میں اس الجھن کو سلجھاؤں۔ تعمیلِ ارشاد کے طور پر یہ چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔

پنڈت نہرو کا یہ الزام سراسر غلط ہے۔ انکا یہ الزام لاعلمی پر نہیں بلکہ بدنیتی پر مبنی ہے۔ پنڈت جی نے یہ بات اپنی کتاب The Discovery of India میں لکھی تھی۔ یہ کتاب انہوں نے سن ۱۹۴۴ء میں قلعہ احمد نگر کے زندان میں بیٹھ کر رقم فرمائی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے بطور شاعر اور مفکر اقبال کے فیضان کی تحسین فرمائی ہے۔ مگر اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت وہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ اقبال ''ایک شاعر' عالم اور فلسفی تھے اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے۔'' جن لوگوں نے اقبال کی شاعری' فلسفہ اور سیاست کا سرسری سے بھی کم مطالعہ کیا ہے وہ بھی اس صداقت کی گواہی دیں گے کہ اقبال کے عہد میں جاگیرداری نظام کا اقبال سے بڑا دشمن ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں سے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے کہ ایک ملاقات کے دوران میں اقبال نے ان سے یہ کہا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں صدر کی حیثیت سے پاکستان کی حمایت کی تھی مگر ان کو یقین تھا کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے مضر ہے۔ شاید انہوں نے اپنا

خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس مسئلے پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت تک اس نے کوئی اہمیت نہیں حاصل کی تھی۔ ان کا عام نظریہ زندگی پاکستان یا تقسیم ہند کے اس تصور کے ساتھ جو بعد میں پیدا ہوا ہم آہنگ نہیں تھا۔ آخر عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا۔ سوویت روس کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور ان کی شاعری کا رخ بدل گیا۔'' (تلاش ہند (اردو ترجمہ)' لاہور' ۱۹۹۲ء' صفحہ ۴۹۹' ص ۴۵۱۔)

جب پنڈت جی نے اپنی کتاب میں درج بالا عبارت لکھی اس سے تین برس پہلے قائداعظم کے دیباچہ کے ساتھ قائداعظم کے نام اقبال کے خطوط شائع ہو چکے تھے۔ یہ انگریزی کتاب یقیناً پنڈت جی کی نظر سے گزر چکی ہوگی۔ اس کتاب میں شامل ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کا وہ طویل خط بھی شامل ہے جس میں پنڈت جی کی ''بے خدا سوشلزم'' کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان تو رہے ایک طرف خود ہندو معاشرہ بھی اس بے خدا سوشلزم کو ہرگز قبول نہ کرے گا۔ پنڈت جی کی سوشلزم کو رد کرتے وقت اقبال نے قائداعظم کو بتایا ہے کہ اگر اسلامی شریعت کو دور حاضر کے معاشی نظریات کی روشنی میں ازسرنو تفسیر کیا جائے تو مسلمان عوام کی روٹی روزگار کا مسئلہ بہتر طور پر حل ہوسکتا ہے۔ مسلمان عوام کو غربت کے عذاب سے نجات دلانے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی الگ قانون ساز اسمبلی ہو اور یہ اسمبلی متحدہ ہندوستان کی بجائے ایک الگ خودمختار مملکت ہی میں قائم کی جاسکتی ہے۔

اس خط کے مندرجات زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ:

(اول) اقبال جواہرلعل کی بے خدا سوشلزم پر اسلام کے اقتصادی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔

(دوم) اسلام کے اقتصادی نظام کو عہد جدید کے سیاق و سباق میں نافذ کرنے کے لیے جداگانہ مسلمان مملکت کا قیام ضروری ہے۔

(سوم) اپنی وفات سے فقط چند ماہ پہلے وہ قائداعظم کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ قیام پاکستان کو کل ہند مسلم لیگ کا سیاسی پروگرام بنالیں۔

(چہارم) اس خط کے آخر میں وہ قائداعظم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا وہ وقت نہیں آ پہنچا جب ہمیں کھل کر قیام پاکستان کو اپنی منزل قرار دے دینا چاہئے؟

اقبال کی وفات سے تین ماہ پیشتر پنڈت نہرو نے میاں افتخارالدین کے ہمراہ جاوید منزل میں علامہ اقبال سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کی خوشگوار یادیں بھی اس کتاب میں موجود ہیں۔ پنڈت جی نے جو واقعہ بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا اسے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب ''اقبال کے آخری دو سال'' میں بیان کر دیا ہے۔ بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:

''پنڈت نہرو اس زمانے میں زور شور سے سوشلزم کا پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے دو اجلاسوں کے وہ صدر رہ چکے تھے اور دونوں مرتبہ اپنے خطبات صدارت میں انہوں

نے کہا تھا کہ ہندوستان کے تمام مصائب کا علاج سوشلزم ہے لیکن کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں میں کوئی شخص بھی اس بارے میں پنڈت نہرو کا معاون یا ہم خیال نہیں تھا بلکہ سردار پٹیل، راج گوپال اچاری اور ستیہ مورتی نے تو علی الاعلان پنڈت نہرو کے اس عقیدے سے اختلاف کا اظہار کیا تھا۔ دوران ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو سے پوچھا کہ 'سوشلزم کے بارے میں کانگریس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں؟' پنڈت جی نے جواب دیا کہ 'نصف درجن کے قریب'۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ 'تعجب ہے۔ خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے۔ ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں۔' اس پر پنڈت جی خاموش ہو گئے۔''

(پہلا ایڈیشن، ۱۹۶۱ء صفحات ۵۴۸۔۵۴۹)۔

اسی ملاقات میں ایک ناگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا جو پنڈت جی نے تو بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں، البتہ، بٹالوی صاحب نے بیان کر دیا ہے:

''ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکا یک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ 'ڈاکٹر صاحب! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے؟ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔' ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے۔ 'اچھا۔ تو چال یہ ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔' اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کر لیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل در معقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کر دیا ہے اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ (ایضاً صفحات ۵۴۹۔۵۵۰)۔

نہ معلوم یہ باتیں پنڈت جی کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں یا انہوں نے ان باتوں کو ناخوشگوار اور اپنی سیاسی آئیڈیالوجی کی تردید سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حیرت یہ ہے کہ انہوں نے ان ناقابل فراموش یادوں کو تو آسانی کے ساتھ فراموش کر دیا مگر ایڈورڈ تھامسن کی گپ شپ کو ناقابل تردید تاریخی صداقت کا درجہ دیا۔

ایڈورڈ تھامسن آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے استاد تھے اور تاریخ ہند سے بھی علمی شغف رکھتے تھے۔ وہ

دو مرتبہ انگلستان کے اخبار مانچسٹر گارڈیئن کے نامہ نگار کے روپ میں بھی برٹش انڈیا تشریف لائے تھے۔ مہاتما گاندھی' رابندر ناتھ ٹیگور' راج گوپال اچاری' سردار پٹیل اور جواہر لعل نہرو کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ جہاں وہ ہمیشہ مسلم لیگ کی مخالفت میں سرگرم رہتے تھے وہاں کانگریس کی پرجوش وکالت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جس روایت کا سہارا لے کر پنڈت جی نے اقبالؒ پر الزام تراشی کی ہے وہ ایڈورڈ تھامسن اور علامہ اقبالؒ کی زبانی گفتگو پر مبنی ہے۔ تھامسن صاحب موصوف کا یہ بیان قائداعظم کے نام اقبال کے متذکرہ بالا خطوط کی دستاویزی شہادت کے ساتھ ساتھ اقبال نہرو ملاقات کے مندرجہ بالا احوال و مقامات کی بنیاد پر جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اقبال آخر دم تک اپنے تصور پاکستان کو قیام پاکستان کی صورت میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں سرشار رہے۔ قائداعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت میں سرگرم عمل رہے اور اسلامیان ہند کو یہ مشورہ دیتے رہے کہ میری زندگی کی دعائیں مانگنے کی بجائے محمد علی جناح کی زندگی کی دعائیں مانگو۔ صرف جناح ہی قوم کی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں:

نگہ بلند' سخن دلنواز' جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

(۲)

نظریاتی اختلاف کے باوجود علامہ اقبالؒ اور پنڈت نہرو کے درمیان ہمیشہ باہمی احترام کے تعلقات قائم رہے۔ ہر دو شخصیات ایک دوسرے کی قدردان تھیں۔ پنڈت نہرو نے سن ۱۹۳۳ء میں لندن کی گول میز کانفرنس میں مسلمان مندوبین کے طرزِ فکر و عمل کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اقبال اس کانفرنس میں شریک تھے مگر نہرو شریک نہیں تھے۔ کانگریس کی نمائندگی مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ مہاتما جی نے واپسی پر کہا کہ انہوں نے تو ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو قبول کر لیا تھا مگر سیاسی رجعت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں نے کانفرنس کو ناکام بنا دیا۔ نہرو نے گاندھی جی کی باتوں میں آ کر مسلمان مندوبین کے خلاف ایک سیاسی بیان داغ دیا۔ اقبال نے گاندھی جی کے اس الزام کی تردید میں جواہر لعل نہرو کے بیان کا جواب دیا۔ اقبال نے اپنا بیان ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا تھا:

> ''میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انہوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانی سیاستدانوں میں کمیاب ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق انہیں پورے حالات معلوم نہیں۔'' (لطیف احمد خان شروانی' حرف اقبال' اسلام آباد' ۱۹۸۴ء' ص ۲۰۵)۔

اس خوش گمانی کے اظہار کے فوراً بعد اقبال نے اصل حالات کو بے نقاب کرتے ہوئے بتایا کہ مہاتما جی نے

مسلمانوں کے مطالبات کو ذاتی طور پر ماننے کا عندیہ تو دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اس بات کی کوئی حتمی ضمانت نہیں دے سکتے کہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ بھی ان مطالبات کو تسلیم کر لے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کانگریس انہیں ان مطالبات کے سلسلے میں مکمل اختیار دینے کے لئے کبھی تیار نہ ہو گی۔ گویا عملاً گاندھی جی نے مسلمانوں کے تمام مطالبات کو رد کر دیا تھا۔ مسٹر گاندھی کی دوسری غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے مخصوص مطالبات کی حمایت ترک کر دیں مگر مسلمانوں نے اچھوتوں کی حمایت سے دستبرداری سے انکار کر کے گاندھی جی کو ناراض کر دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس رویہ کی حمایت میں پنڈت جی کی لب کشائی پر اقبال حیرت زدہ رہ گئے۔ چنانچہ اپنے اس بیان میں انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ :

''اپنے زبان زدِ عام سوشلسٹ خیالات کے پیشِ نظر پنڈت جواہر لعل نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمایت کریں گے؟ ..... کم از کم انہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا الزام دیں۔ اس صورت میں وہ لوگ جو ہندوؤں کے فرقہ پرستانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پنڈت جی فرقہ وارانہ فیصلے کے خلاف ہندو مہاسبھا کی جاری کردہ مہم میں ایک سرگرم رکن ہیں۔''

مسلمانوں کے خلاف پنڈت جواہر لعل نہرو کا دوسرا الزام یہ تھا کہ مسلمان ہندوستانی قومیت کے مخالف ہیں۔ اس کے جواب میں اقبال نے کہا کہ :

''اگر قومیت سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتیاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک کر دیا جائے تو پھر خود میں ہی اس نظریۂ قومیت سے انکار کا مجرم ہوں ..... میں پنڈت جواہر لعل نہرو سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنہیں وہ اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے نہ مان لے اور نہ ہی ثالث کا فیصلہ تسلیم کرے بلکہ واحد قومیت کی ایسی رٹ لگاتی رہے جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں۔ یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی۔ یا پھر ملک کو مذہبی' تاریخی اور تمدنی حالات کے پیشِ نظر اس طرح تقسیم کرنا ہوگا کہ موجودہ شکل میں انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۲۰)۔

پنڈت نہرو کے بیان کے جواب میں دیا گیا اقبال کا یہ بیان یقینی طور پر پنڈت جی کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اس بیان میں از اول تا آخر اقبال کا ترقی پسند' وسیع النظر اور انسان دوست مسلک نمایاں ہے۔ سارا کا سارا استدلال برٹش انڈیا کی خودمختار ممالک میں تقسیم کی حمایت میں ہے۔ یہ

بیان تصورِ پاکستان کی نفی سے نہیں بلکہ اثبات سے عبارت ہے۔ ایسے میں پنڈت جی کا یہ کہنا کہ سن ۳۰ کے بعد اقبال اپنے تصورِ پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے دیانت داری پر مبنی نظر نہیں آتا۔

جب پنڈت نہرو نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں دنیائے اسلام کی صورت حال پر تین مضامین میں وطنیت اور لادینیت کے فروغ کا خیر مقدم کیا تو اس کے جواب میں اقبال نے بھی ماڈرن ریویو ہی میں پنڈت جی کی فکری گمراہی کو راست فکری میں بدلنے کا سامان کیا۔ اپنے طویل مضمون کے آغاز میں اقبال نے برملا اعلان کیا کہ:

''میں اس بات کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ جس انداز میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایک ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ وہ اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو۔'' (ایضاً، ص ۲۰۷ اور ۲۰۸)۔

اقبال کا یہ تجزیہ کہ پنڈت جی کی سیاسی تصوریت نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے وقت نے بہت جلد سچ ثابت کر دکھایا۔ جب پنڈت جی کے دل میں برصغیر کی زندگی کے ٹھوس حقائق کا احساس جاگ اٹھا تو وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بھی ٹھوس حقائق یعنی قیام پاکستان کی حقیقت کو قبول کرنے کا مشورہ دینے لگے۔ مولانا آزادؒ نے اپنی تصنیف India Wins Freedom میں اس بات کا ذکر یوں فرمایا ہے:

"After a few days Jawaharlal came to see me again. He began with a long preamble in which he emphasized that we should not indulge into wishful thinking, but face reality. Ultimately he came to the point and asked me to give up opposition to partition." (p.185)

اسلامیان ہند نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کے سے سیاسی خواب پرستوں کو زندگی کے جن حقائق کا احساس دلا دیا تھا اقبال نے برسوں پہلے پنڈت جی کو ان حقائق کی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ سیاسی تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے حقائق سے فرار کرنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان سے پنجہ آزما ہوا جائے۔ اپنے زیرِ نظر مضمون میں بھی علامہ اقبال نے جداگانہ مسلمان قومیت کے سوال پر دوٹوک انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ اقبال نے اسلامیانِ

ہند کے سیاسی مسلک پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی:

''اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموس وطن کے لئے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحاد انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے..... جداگانہ مسلمان قومیت کا سوال صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی جز ہے..... میں یقینِ کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامیانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔'' (حرفِ اقبال۔ صفحات ۱۴۵۔۱۴۶ اور ۱۴۷)۔

اقبال کا یقینِ کامل بالکل درست نکلا۔ اسلامیانِ ہند نے' بالآخر' متحدہ ہندوستانی قومیت کی سیاسی تصوریت کو پادر ہوا ثابت کرتے ہوئے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان قائم کر لیا۔ ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہوگئی اور یوں پاکستان میں اسلام سے عشق اور وطن سے محبت میں کوئی تضاد باقی نہ رہا۔ اب ہمارا دین اسلام ہے اور ہمارا وطن دارالاسلام ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمہ سید مزمل حسین

کیا یہ تہذیبی کشمکش ہے؟

پروفیسر فرانسس روبنسن

(پروفیسر فرانسس روبنسن کا تعلق لندن یونیورسٹی کے شعبہ جنوبی ایشیا سے ہے۔ اس کے علاوہ اس یونیورسٹی کے رائل ہالووے کے نائب پرنسپل بھی ہیں ان کی تالیفات میں فرنگی محل کے علماء اور اسلامی ثقافت' جنوبی ایشیا میں اسلام اور اس کی تاریخ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیمبرج کی طرف سے شائع ہونے والی مسلم دنیا کی تاریخ کے بھی وہ مدیر ہیں جلد ہی ان کی ایک اور کتاب بعنوان ''جدید جنوبی ایشیا میں اسلام'' منظر عام پر آنے والی ہے۔

یہ 1993ء کی بات ہے جب ''فارن آفیئرز'' نامی مجلّے میں ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن کا ایک مضمون ''تہذیبوں کے مابین تصادم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ 1996ء تک پروفیسر مذکور نے اپنے مضمون کو ایک مکمل کتاب کے رنگ میں ڈھال لیا تھا جو تہذیبوں کے مابین تصادم اور نئے عالمی نظام کی ساختِ نو کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔

پروفیسر سیموئیل نے اپنے خیالات کی بنیاد اس بات کو بنایا تھا کہ سرد جنگ کے بعد کے زمانے میں لوگوں کے مابین کشمکش کسی نظریاتی اختلاف یا کسی اقتصادی مسئلے پر نہیں بلکہ تہذیبی اختلاف کی بنیاد پر ہو گی خود پروفیسر سیموئیل کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس موقف کو اتنی حیرت انگیز پذیرائی ملے گی اور وہ نئے عالمی نظام کے ایک اہم پالیسی ساز کی حیثیت اختیار کر لے گا یہ پروفیسر سیموئیل کے خیالات کا ہی اثر تھا کہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کی بات کرتے وقت انہیں دیگر تہذیبوں خصوصاً مغربی تہذیب کے لئے ایک چیلنج سمجھا جانے لگا تمام سیاسی معاملات کو تہذیب کے اختلاف کی عینک سے دیکھنے کا رویہ پروفیسر سیموئیل کے مضمون اور کتاب کی پذیرائی کی وجہ سے ہی عام ہوا۔

آج کا یہ لیکچر اسی پیش منظر میں خصوصاً گیارہ ستمبر 2001ء کے واقعات کے بعد کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے ہمیں اپنی تہذب کے لئے مسلمانوں کو ایک خطرہ سمجھنے سے قبل اس بات کا برملا جائزہ لینا ہو گا کہ

تہذیب وتمدن کے لئے گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال کے عرصے میں مسلمانوں کی خدمات کیا رہیں اور انہوں نے کس طرح لوگوں کو متاثر کیا' ہم یہ بات کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں کہ کبھی مسلمان غالب رہ چکے ہیں۔ کیا ہم یہ بھلا سکتے ہیں کہ کبھی مسلمانوں کا جزیرہ نمائے عرب سے لے کر ہندوستان اور پھر چین تک غلبہ تھا۔ مغرب کی فوجی یلغار کو تو محض دو سو سال ہو رہے ہیں 1798ء میں نپولین نے مصر پر قبضہ کیا تو قیادت مغرب کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ صحیح ہے کہ مغربی افواج نے ہندوستان' جنوب مشرقی ایشیا' افریقہ کے شمالی جنوبی اور مغربی علاقوں' وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کے اکثر علاقوں کو روند ڈالا۔ ایک وقت وہ بھی عالم اسلام پر گزرا ہے کہ 1920ء کی دہائی میں صرف ایران' افغانستان' ترکی' جزیرہ نمائے عرب کا وسطی حصہ اور یمن ہی مغربی دسترس سے باہر رہ گئے تھے بلکہ ان میں سے بھی بعض علاقے کسی نہ کسی طرح مغربی اثر کے ماتحت تھے۔ خلافت جو رسول اکرمؐ کے ساتھ مسلمانوں کے جذباتی تعلق کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے ختم کر دی گئی تھی۔ مسلمانوں کو ان کے مرکز اتحاد سے دور کر دیا گیا تھا لیکن پھر کیا ہوا کیا مسلمان صفحہ ہستی سے محو ہو گئے؟ یقیناً آپ کہیں گے کہ ایسا نہیں ہوا مسلمان بحیثیت ایک قوم اور امت کے باقی رہے۔ یہ صحیح ہے کہ خلافت عثمانیہ کی جگہ جدید ترک جمہوریہ نے لے لی لیکن یہ بھی مسلمانوں کے حق میں ایک اچھی تبدیلی ثابت ہوئی۔ 1990ء کی دہائی میں سویت یونین کے تسلط سے کئی مسلمان ریاستیں الگ ہو گئیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہئے کہ یہ مکمل آزادی بہرحال نہیں تھی اس لئے کہ ان علاقوں کے مسلمان حکمران بڑی حد تک اپنے سابق آقاؤں کے زیر اثر ہی رہے۔ مغربی اور غیر اسلامی اقدار ابھی تک ان ملکوں پر اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے عالم اسلام میں اپنی اصل قرآن وسنت کی طرف لوٹنے کی تحریک کا آغاز ہوا۔ بے شمار مسلمانوں نے اس تحریک کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک وہ وسیع پیمانے پر کوئی قابل ذکر تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تاہم یہاں تین اہم معاملات اور ان کے اثرات کا ذکر ازبس ضروری ہے۔

مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ وہ اپنی کسی عزیز ترین متاع سے محروم ہو چکے ہیں اب مسلمانوں میں یہ احساس عام ہو چلا ہے کہ وہ مغرب کے مقابلے میں مجبور اور بے بس ہیں اس سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں اس احساس کی شدت بہت زیادہ ہے جہاں پینتیس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان رہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑی تعداد ہے۔

1800ء کے بعد سے اکثر مسلمان علاقوں میں اتحاد بین المسلمین کی تحریک نے خاصا زور پکڑا ہے اس کی وجہ یہ اسلامی حکم بھی ہے کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اگر جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرا حصہ لازماً بے چین ہو جاتا ہے احادیث نبویؐ میں اس مفہوم کے کئی فرامین ملتے ہیں۔

اس عرصے میں ایک اور اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ پوری مسلم دنیا میں احیائے اسلام کی ایک تحریک چل رہی

ہے یہ تحریک خاصی موثر ہے اور اس کی جڑیں بہت گہری ہیں اور یہ پوری قوت کے ساتھ مغرب سے ٹکر لے رہی ہے کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد سے عالم اسلام میں جتنی بھی اسلامی تحریکیں ابھریں ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح عالمی اسلامی تحریکوں سے تھا بظاہر یہ اسلامی تحریکیں اس سے انکار کریں گی لیکن ان کے اجزائے ترکیبی پر نظر رکھنے والا باآسانی یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ وہ عالمی اسلامی تحریک سے متاثر ہیں۔

یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اسلام کے احیاء کی تحریک ہمارے لئے انوکھی چیز نہیں ہونی چاہئے خود مسیحی دنیا میں پروٹسٹنٹ فرقے کے خیالات کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ احیاء کی تحریک ہمارے ہاں بھی موجود ہے اس تحریک کا بنیادی نقطہ بھی اپنے اصل کی طرف رجوع ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ عالم اسلام میں احیاء کی تحریکوں نے ہمارے ہاں کی پروٹسٹنٹ تحریک سے کئی نوع کے اثرات قبول کئے ہیں۔

ان تحریکوں میں سے ایک وہابی تحریک ہے جسے اٹھارہویں صدی کے جزیرہ نمائے عرب کے ایک عالم محمد بن عبدالوہاب نے شروع کیا تھا اسلام کی اصل کی طرف رجوع کو بنیاد بنانے والے اس سکالر کو اتنی زیادہ پذیرائی نہ ملتی اگر اسے 1744ء میں ایک قبیلائی سردار محمد بن سعود کی حمایت نہ ہوتی۔ محمد بن عبدالوہاب کے پیام اور محمد بن سعود کی حکومت کی خواہش دونوں نے ایک ساتھ مل کر بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ پہلی سعودی شاہی حکومت 1818ء تک چلتی رہی پھر اسے مصر کے ابراہیم پاشا کی افواج نے روند ڈالا ٹھیک ایک سو سال بعد 1920ء کی دہائی میں ایک بار پھر سعودی خاندان نے مذہبی قیادت کو اہم مناصب دے رکھے ہیں یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کا نظام رواں دواں ہے تاہم سعودی خاندان کی بڑھتی ہوئی بدعنوانی اور ان کی حد سے گزری امریکہ کی تابعداری پر لوگوں میں ناراضی کے اثرات اب ظاہر ہونے لگے ہیں۔ عام شہریوں کی معاشی حالت بھی تیزی سے اب روبہ زوال ہے۔ بے روزگاری میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ایک عام شہری کی فی کس سالانہ آمدنی اٹھائیس ہزار ڈالر سے گھٹ کر اب محض سات ہزار ڈالر رہ گئی ہے۔

سعودی حکمرانوں کو عوام میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ کا شدت سے احساس ہے اس لئے وہ فلسطین کی اسلامی تحریک حماس' مصر کی اخوان المسلمون' پاکستان کی جماعت اسلامی اور الجزائر کی اسلامی نجات پارٹی کو کسی نہ کسی طرح مالی امداد دے کر راضی رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اپنے حکمرانوں سے عام سعودی شہریوں کی ناراضی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ گزشتہ ستمبر میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کی عمارتوں پر مبینہ طور پر طیارے ٹکرانے والے افراد میں سے نصف سے زیادہ کا تعلق سعودی عرب سے تھا۔ اسی طرح اسامہ بن لادن اور اس کے پیروکار بھی مسلسل یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ان کا مقصد موجودہ سعودی حکومت کو اقتدار سے محروم کرنا ہے۔ اسلام کی اصل کی طرف رجوع کی تحریک کا ایک اور اہم مرکز جنوبی ایشیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنوبی ایشیا کے اثرات کے باعث ہی طالبان نے جنم لیا تھا اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں 1867ء میں دارالعلوم دیوبند کے

قیام سے اپنی بات کو آگے بڑھانا ہو گا دیوبند محض ایک مدرسے کا نام نہ تھا بلکہ یہ اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی گزارنے کی ایک تحریک تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دیوبندی علماء کی اکثریت نے پاکستان بننے کی بھرپور مخالفت کی لیکن جب پاکستان بن گیا تو انہوں نے اسے اور افغانستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ پاکستان میں 1980ء کی دہائی کو دیوبند مدارس کے فروغ کی دہائی کا نام دیا جا سکتا ہے اس زمانے میں دیوبندیوں کو سعودی عرب اور دیگر خلیجی ممالک سے بے پناہ مالی امداد ملی۔ اسی طرح جنرل محمد ضیاء الحق کی اسلامائیزیشن کی پالیسی سے بھی انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے لئے ضیاء الحق اور امریکہ نے ان مدارس کو خوب استعمال کیا مگر بعد میں طالبان کی صورت میں پاکستان نے جو بت تراشا تھا اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے توڑ ڈالے اور اس سے بھی آگے اب پاکستان سے کشمیر میں بھی یہی کچھ کروایا جا رہا ہے۔

اسلامی تحریک کو دنیا بھر میں ایک عجیب صورتحال سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا مقابلہ سیکولر یا سیکولرازم سے متاثر حکمرانوں سے ہے۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تحریکیں خصوصی طور پر 1970ء کے بعد سے متحرک نظر آتی ہیں ان میں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مصر کی اخوان المسلمون، فلسطین کی حماس، ترکی کی رفاہ پارٹی اور دیگر کئی تحریکیں شامل ہیں لیکن ہماری بات مکمل نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم 1979ء کے ایران کے اسلامی انقلاب کا ذکر نہ کریں ایران کے انقلاب نے مغرب کے سارے اندازے ہی تلپٹ کر ڈالے۔ اسی طرح مصر کے صدر انوار السادات کا قتل اسلامی تحریکوں کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ پاکستان کے دستور میں اسلامی شقوں کا شامل کیا جانا بھی اسی نوع کا دوررس اثرات کا حامل ایک قدم تھا۔

یہاں ایک اور اہم نقطے کی جانب آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا کہ اسلامی تحریکوں کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ عصر حاضر کے تقاضوں سے نابلد ہیں صریحاً غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاصر اسلامی تحریکوں کے اہم رہنما تو مغرب کے تعلیمی اداروں کے گریجویٹ ہیں اور وہ مغرب سے بڑی حد تک متاثر بھی ہیں۔ مصر کے اخوانی رہنما سید قطب فرانس کے ایک فاشسٹ مفکر الیکس کارل سے اور اپنے دورہ امریکہ سے ازحد متاثر ہوئے۔ ایران کے اسلامی انقلاب کے محرکِ حقیقی ڈاکٹر علی شریعتی سارترے، فینن اور لوئیس میسی گونن سے متاثر ہوئے۔ ترکی کے نجم الدین اربکان پیشے کے اعتبار سے ایک انجینئر ہیں۔

اسلامی تحریکوں کے رہنماؤں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً نقل مکانی کرتے رہے ہیں۔ وجوہات معاشی ہو سکتی ہیں، طبی یا کسی اور نوع کی لیکن ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا سلسلہ اکثر جاری رہتا ہے اس سے ان کا پیغام معاشرے کے زیادہ سے زیادہ طبقوں تک پہنچتا رہتا ہے اور وہ ہر جگہ اپنے افکار کا پودا کاشت کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں پر بات کرتے ہوئے اس بات کا بھی اظہار ضروری ہے کہ وہ ابھی تک اکثر و بیشتر حالات میں

کسی بڑی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا مغرب اور امریکہ کو اسلامی تحریکیں اپنا ہدف خیال کرتی ہیں اور امریکی مفادات پر ضرب کاری کی ہمیشہ تلقین کرتی رہتی ہیں۔ سعودی عرب' پاکستان اور مصر میں لوگ امریکی مفادات پر ضرب کاری لگانے کے محض اس لئے کوشاں رہتے ہیں کہ امریکہ کے ان کے بارے میں رویے سے بے زار ہیں۔ اسی طرح ان ملکوں میں بڑھتی ہوئی غربت بھی لوگوں کے غیض وغضب میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اوپر کھینچی گئی تصویر سے کس حد تک یہ بات منظر عام پر آتی ہے کہ عالم اسلام اور مغرب کے درمیان ایک تہذیبی کشمکش جاری ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیں گزشتہ چودہ سو سال ہمارے اور اسلام کے درمیان کسی حد تک تہذیبی کشمکش کے سال رہے ہیں۔

کیا ہم نے مغربی ایشیا اور اسپین میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگیں نہیں لڑیں کیا عثمانی کئی سو سال تک یورپ کو اپنی سالانہ یلغاروں کا جنہیں وہ جہاد کا نام دیتے تھے نشانہ نہیں بناتے رہے۔ یہ ٹکر اور مخاصمت یقیناً ہمارے اور مسلمانوں کے درمیان وقوع پذیر ہونے والی تلخ حقیقتیں ہیں لیکن کیا اب ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہمارے تعلقات کی سوئی نفرت پر اٹکی رہے؟ ہمیں اپنی سابقہ لڑائیوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہو گا کہ ہم نے ایک دوسرے سے کتنا کچھ لیا ہے۔ اسلام میں آفاقیت کے جو مظاہر دکھائی دیتے ہیں وہ مسلمانوں نے ہماری بازنطینی روایت سے لئے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں یورپ اٹلی اور اسپین کے راستے پہنچنے والے' اسلام کے نور سے مستفید ہوتا رہا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ مسلماں اور مسیحی دنیا نے ماضی میں ایک دوسرے سے بہت کچھ لیا ہے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے درمیان یہ فیصلہ کریں کہ ہم نے اسلامی تحریکوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے کیا ہمارا سلوک نفرت اور دشمنی کا ہی رہنا چاہئے کیا ہم اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں کہ اسلامی تحریکیں اپنے ملکوں میں بہت اہمیت حاصل کر چکی ہیں اور وہ کئی جگہوں پر اقتدار کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ مسلمان ملکوں کے نوجوان تیزی سے اسلامی تحریکوں سے متاثر ہو رہے ہیں۔ مسلمان نوجوان اپنی آبادیوں کا 1980ء کی دہائی میں اٹھارہ فی صد تھے تو 2025ء میں وہ تیس فی صد ہوں گے۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے سابقہ رویوں کی وجہ سے اسلامی تحریکیں اپنے اقتدار کے ابتدائی سالوں میں ہمارے خلاف خاصی تلخ نوائی کا سہارا لیں گی جیسا کہ ایران کے انقلاب کے موقع پر ہوا۔ یہاں میں اس وقت کے ایران میں برطانوی سفیر انتھونی پارسنز کی رائے کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں وہ رائے یہ تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ مغرب کے بارے میں لوگوں کی رائے بدلتی جائے گی۔ مسلمان ملکوں کے معاشی اور جغرافیائی حالات اسلامی تحریکوں کو اپنے رویے پر نظر ثانی پر مجبور کر دیں گے ہم اچھی طرح دیکھ رہے ہیں کہ اب ایران ہمارے بارے میں خاصے معقول رویے کا مظاہرہ کر رہا ہے اس نے افغانستان میں امریکہ کے زیر اثر اتحاد کی

مداخلت اور امریکہ میں اپنے طلبہ کے جانے کے معاملے پر خاصی لچک کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ وہ اب امریکہ جسے وہ بڑا شیطان قرار دیتا ہے کے بارے میں خاصی تبدیلی فکر کا مظاہرہ کررہا ہے۔

اب ہمیں اس بات پر نظر ڈالنا ہوگی کہ اسامہ بن لادن اور اس کا القاعدہ نیٹ ورک واقعتاً اسلامی تحریک کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ جی ہاں ان کا دعویٰ تو یہی ہے 1999ء میں اس نے ایک کتاب امریکہ اور تیسری عالمگیر جنگ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے وہ امریکہ اور مغرب کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف تہذیبی کشمکش کی کھل کر بات کرتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ وہ پورے مغربی تسلط کو زیر و زبر کر کے دم لے گا۔

بہرحال اب وقت آ گیا ہے کہ امریکہ اور دیگر مغربی اقوام مسلمانوں کے بارے میں اپنے طرز عمل کا ازسرنو جائزہ لیں ہمیں مسلم رائے عامہ کو اپنے خلاف نہیں جانے دینا چاہئے۔ 2025ء میں مسلمان پوری دنیا کی آبادی کا ایک تہائی ہو جائیں گے انہیں کسی طور بھی نظرانداز کرنا خود ہمارے مفادات کے قطعاً منافی ہے اگر ہم نے مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا لحاظ نہ کیا تو تہذیبی کشمکش مزید شدت اختیار کر سکتی ہے۔

نوٹ:- پروفیسر فرانسس روبنسن کے اس لیکچر کے تمام مندرجات سے ادارہ طلوع اسلام کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔ خاص طور پر ان کے خیال سے کہ ''اسلام میں آفاقیت کے جو مظاہر دکھائی دیتے ہیں وہ مسلمانوں نے ہماری بازنطینی روایت سے لئے ہیں'' متفق ہونا ممکن نہیں ہے۔ قرآن کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم بھی یہ جانتا ہے کہ قرآن کا خطاب ہی ''الناس'' سے ہے' پوری نوعِ انسانیت بلا رنگ' نسل' قوم اس کی مخاطب ہے۔ بہرحال ہمارا ارادہ اس مضمون کا محاکمہ پیش کرنے کا نہیں ہے۔ پادری جورائٹ اور فرانسس روبنسن کی تقاریر کا ترجمہ شاملِ اشاعت کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین طلوع اسلام کو مغربی دانشور اور مذہبی طبقہ کے افکار واحساسات سے روشناس کرایا جائے اور ان کا نقطۂ نظر بھی ہمارے سامنے رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی محمد چدھڑ

شریعت

اَلشَّرِیَعۃ ۔ پانی کے اس گھاٹ کو کہتے ہیں جس کا پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو۔ جو بند نہ ہو۔ کھلا ہو۔ اور سطحِ زمین پر جاری ہو۔ یعنی اسے حاصل کرنے کے لئے رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر بارش کا جمع شدہ پانی ہو تو شریعت نہیں بلکہ **کــــــرعٌ** کہلائے گا۔ اسی سے شارع عام' راستہ کو کہتے ہیں۔ جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں۔ الشرع اس سیدھے راستے کو کہتے ہیں جو واضح اور کھلا ہو۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ دین سے مراد وہ غیر متبدل اصول اور قوانین ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بذریعہ وحی قرآن حکیم میں دیئے اور شریعت سے مراد وہ جزئیات ہوں گی جو ہر زمانہ کے انسان ان اصول وقوانین کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے اپنے زمانہ کے مطابق باہمی مشاورت سے خود مرتب کریں گے۔

لہٰذا یہ شریعت ایسی ہوگی جس میں جمود وتعطل نہ ہو۔ اس میں تسلسل ہو جو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے۔ اگر یہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی اور یہ زندگی بخش نہیں رہے گی۔ لہٰذا یہ پراسس (Process) مسلسل اور متواتر آگے بڑھتا جائے گا۔

یوں تو مذہب کی دنیا میں امیر شریعت یا مفتی حضرات کی بھی کوئی کمی نہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تمام صاحبان اپنے ان خود ساختہ عقائد کو خدا کی طرف ہی منسوب کرتے ہیں۔ بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی مختلف آیات کے حوالہ سے اپنی مقدس کتاب میں کیا فرما رہے ہیں۔ مفہوم:

''ان سے کہہ دو کہ جو لوگ اپنے ذہن کے تراشیدہ عقائد کو ناحق خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اس قسم کی خانہ ساز شریعت سے انہیں کچھ دنیاوی مفادات تو حاصل ہو جائیں گے لیکن آخرکار انہیں ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا کرنا ہوگا اور شدید ترین عذاب کا مزہ چکھنا پڑے گا۔''

(۱۰/۶۹۔۷۰)

قوانین خداوندی کی جزئیات ایک ہی دفعہ ہمیشہ کے لئے متعین نہیں کی جاسکتیں۔

''ایمان والو! دین کے سلسلہ میں جو کچھ دینا ضروری

تھا وہ قرآن میں دے دیا گیا ہے اور جو کچھ دینا ضروری نہیں تھا اس کے متعلق مت پوچھو۔ قوانین خداوندی کی جو جزئیات انسان کے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق طے کرنی ہیں وہ اگر ابھی دے دی جائیں تو تم مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ جس صورت میں کہ نزول قرآن کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے اصرار پر اگر ہم نے ان جزئیات کو بھی متعین کر دیا تو مختلف دور میں ان کا نباھنا ممکن نہیں ہوگا۔ بہرحال اللہ نے تمہاری اس لغزش سے درگزر کیا۔ لیکن آئندہ محتاط رہو۔ اللہ بڑا ہی بردبار اور حفاظت دینے والا ہے۔ تم سے قبل بھی ایک قوم نے اس قسم کی جزئیات طلب کی تھیں۔ جن کا نباھنا ان کے لئے ممکن نہ رہا۔ تو دین سے ہی منحرف ہو گئے۔ دیکھو! ہمارا بنیادی قانون تو شروع سے ایک ہی ہے۔ لیکن ان کے عملی نقاط کی شکلیں مختلف ادوار میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مختلف قوموں میں مختلف رہی ہیں۔ لہٰذا یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر جھگڑا کیا جائے۔ تم نظام خداوندی کی طرف دعوت دیتے جاؤ۔ بلاشبہ تم ایک متوازن اور سیدھی روش زندگی پر ہو۔'' (مفہوم ۱۰۲۔۱۰۱/ ۵)۔

دیکھو تمہاری شریعت کی بنیاد اللہ کی کتاب قرآن پر ہونی چاہئے۔

''دیکھو! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) نازل کی ہے۔ جو حق لے کر آئی ہے۔ یہ ان تمام دعوؤں اور وعدوں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے۔ جو کتب سابقہ میں کئے گئے تھے۔ اس اصولی تعلیم کی جامع اور نگران و نگہبان ہے۔ جو پہلے دی جاتی رہی۔ لہٰذا تم اپنے معاملات کے فیصلے اللہ کی نازل کردہ کتاب پر کرو۔ اور اس سلسلہ میں لوگوں کے خیالات و خواہشات کے پیچھے مت چلو۔ اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آ چکا۔ دیکھو! ہم نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہم ہر کسی کو اس کی اختیار کردہ شریعت اور راہ عمل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور سب کو ایک ہی راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کرتے۔ اور نہ زبردستی امت واحدہ بناتے ہیں۔ اسلئے کہ اللہ چاہتا ہے کہ تم اپنے اختیار و ارادہ سے اس نظام کو اپناؤ جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔ لہٰذا سبقت لے جانے کی کوشش کرو سابقہ ادوار پر فلاح انسانی کے کاموں میں۔'' (۴۸/ ۵)۔

قوانین خداوندی کے خلاف شریعتیں انسانی معاشرہ کے لئے عذاب بن جاتی ہیں۔

''ان لوگوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہوا ہے۔ جو ان کے دین میں ایسی شریعتیں وضع کرتے ہیں۔ جو اللہ کے قوانین کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ان کی اجازت نہیں۔ اگر اللہ کا قانون مہلت کار فرما نہ ہوتا تو ان کی اس روش کے نتائج فوراً ان کے سامنے آ جاتے۔ اور قصہ تمام ہو جاتا۔ بلاشبہ وقفہ مہلت کے بعد ان ظالمین کے لئے ان کی خود ساختہ شریعتیں عذاب کی صورت اختیار کر لیں گی۔'' (مفہوم ۴۲/۲۱)۔

DUALISM

By
A. Rashid Samnakay

==========

Dualism is the belief in two distinct divine deities, or recognition of two independent *powers* or principles.

From time immemorial it seems that it was necessary for mankind, to have a presence of some sensory and tangible form of god. A unique and universal godhead was too nebulous and remote concept for the not so mature human intellect of the masses to fathom. Invention of various earthly facets and incarnations of god on earth was therefore undertaken by an elite and enterprising group of people.

This occurred not only to satisfy the above need of the masses, but particularly the desire of that group to **share** in the power, status, wealth and glory of God, by systems, whereby they were entrenched as 'go-between' the god or gods and the masses. This form of dual authority exists even today in almost all religions.

The Muslim context

It appears that Muslims also have not escaped this trauma, for barely hundred years after Hijra the *taghutis* (powers of evil-M Asad), raised their heads with the result that ordinary Muslims fell pray to them and were enslaved by myriads of institutionalised demigods, some of whom are listed below. The justification for their existence was sought in the man made documents canonised by them selves as divine for their own aggrandisement and therefore as **article of faith,** in contradiction of Quraan.

As a result some issues are raised and briefly discussed. Only a few Quraanic references are given where its context is necessary for the brevity of the article. Also I do not use the acronyms PBUH or SAW with reference to Rasullullah!

A Muslim's Pledge

> *"Allah has said 'do not take for obedience two gods', for there is none like HIM,* ***'then fear ME only'*** *–16-51 Yusuf Ali"* (fear equals Awe or Consciousness)
>
> "Allah, whose absolute law is in operation in the entire universe with perfect order and discipline-same Allah says to mankind that they should also enforce

only HIS law in their affairs – they should not accept two authorities" (16-51, Exposition of Holy Quraan, G.A. Perwez).

Islam came to emphatically establish monotheism, **"*none other than Allah*(**112-1)" for obedience and the implementation of HIS Deen (the code) as proclaimed by Abraham the Hanif (the pure) and the patriarch of the 'people of the book'. Muslims are designated the *millat* (community) of Ibrahim in Quraan. (2-135,22-78)

Both, 'Dualism' of the Jews and Christians in Hijaz (Uzair and Isa as sons of God 9-30) and 'Trinitarian-ism' of the Christian sects -The Father, the Son and the Holy Spirit, of the *Ahlul Qitab*-people of the book are prohibited, as are all forms of polytheism. This prohibition in Islaam is singularly emphatic and does not tolerate **reverence** to any other being other than Allah. For HE is the creator of the entire universe and therefore nothing HE has created can be raised to a plane of reverence. Ibrahim's pledge has percolated down to Muslims through the Quraan, for Muslims pledge:

> ***"I have turned my (complete) attention towards one who is the primal creator of the heavens and the earth. In purity of Iman (trust), as a Muslim and I am not among those who ascribe partners to HIM. My adherence (to Islaam), all my endeavours and my life and death are for none but Allah, who sustains the entire universe. That is what I have been commanded and I am the first of those who submit to HIS will***
>
> ***(6-161*,to163)."**

This **pledge** is of absolute significance to the core values, which makes one a Muslim.

With the above as the bed rock of one's Iman, there is no room to introduce any person, king, queen, despots, messengers, apostle, assistants, wali, saint, pirs, who and what ever, sandwiched between Allah and man kind. There is no **divinity** attached to any man or object. Neither is there any other Book, except Quraan (28-85), to establish Allah's authority over mankind.

This then brings one to the vexing question of the *peripheral attachments*, which have been created and touted as the **articles of faith** for a Muslim, negating the above.

<u>Hadis</u> (Traditions of the Rasool)

For a layperson, when confronted with the contention, that the belief in Hadis for a Muslim is an article of faith similar to that in Quraan, it compels one to follow Hadis as an **ordained** document. But this contention raises the <u>Hadis on par with</u>

Quraan and therefore gives authority to 'man' to legislate laws out side the code ad-Deen. It is necessary to intellectually investigate the question of parity of these two documents, as coming from the one God '*Allah'*. The following demonstrates that the contention is based on unsound premise, in the light of Quraan in my view.

Historical

Historically the revelations (wahi) were revealed to Muhammad at the beginning of the seventh century CE containing over two hundred Quls (instructions to say) to the Rasool, and were penned and compiled as Quraan in the Messenger's own lifetime. Simultaneously there was a corps of people who had memorised the revelations under the guidance of the Messenger himself. (Many references are available on the subject).

The Hadis compilation is accepted to be undertaken by various Muhaddiseen (Hadis compilers), about one hundred and eighty years after Rasullullah's death, give or take a few years. For example Bukhari lived 810 to 870 CE (who too is held in reverence).

The Hadis therefore is a later day record of what the man Muhammad ibn Abdullah alleged to have had said and done, and compiled by the compilers from oral stories and narrated by a chain of reporters of various reputes, capabilities, knowledge, and memory retention and spread over a long period of time. Hence the twenty or so gradations of Hadis, starting with Sahi (true) and ending with Lagu (nonsense). Further more it is established that the compilers were scholars of Arabic, but mainly from outside the Arabian peninsular. (Refer to the copious Hadis literature available.)

Muhammad the Messenger (Rasool)

In the light of Quraan, the collection of Wahi, the Quraan, which was compiled by Muhammad himself; it is seen that his personality has two distinct facets:

1- That he was ***a messenger*** *like many before him* (3-144). His messenger-ship (Risaalat) is therefore embedded in the Risaalaah, the Quraan (4-50,46-9) and nothing else (21-45). The obedience of the Rasool, ordained through the Risaalaah is for as long as the Risaalaah is with us and that is forever for *Allah has taken its responsibility upon Himself* ***(***15-9***)***. And HE is eternal.

The obedience of the Rasool when he was alive and directing the affairs of his people was equally emphatic, for he was a person of exceptional character, chosen for the task and the living role model-"*O you who believe and obey Allah and HIS Apostle turn not away from him* ***when you hear him speak***" 8-20.

Those instructions (hidaya) he gave to the Ummah in that time frame in accordance to the Wahi were therefore from a Rasool, hence the "obedience" to the Sunnah of Rasool was compulsory "*who ever obeyed the Rasool, obeyed Allah **4-80**"*. Thus the obedience of Allah, Quraan and the Rasool are one and the same. It is noteworthy that neither he nor the *Khulafaa-Rashideen* documented his Sunnah, for the simple reason that the Risaalaah (Quraan) was being compiled and documented during his lifetime.

Mohammad the man (Bashar)

2- That he was also ***a human being*** -Bashar, *like any other* (18-110).

His significance as a man –'Bashar' was tied down to the 'time frame' he lived in. The recording in Hadis of his actions, deeds and sayings as a human being, as head of state, head of family, family member, friend, father, husband, trader etc is; -a) recorded by others much later in historic time, b) a long chain of reporters required to cover that time span, c) full of ambiguities in those reports (refer to Hadis books) and therefore, d) full of confusion and contradiction and even casting aspersions on his character, eg being a paedophile! As such it has no place in the article of faith of a Muslim. It may well be asked, how and why did Hadis then came about?

"Mohammedanism" is a foreign concept in Islaam and "Mohammadan" a slur on Muslims, for it means Muslims worship *a man*. His departure from the world did not leave a void. He was not a King and is not a king in waiting to come for a second coming. The Risaalaah is and will always be among the Muslims, for Allah has *preserved it* 85-22**.** As for the man Muhammad, "*if he died or were slain will you then turn back on your heals*?"3-144.

Agarchey makadeh say uth kay chaldiya Saqi

woh may woh kham woh surahi woh jaam baqi hay.(Iqbal-urdu)

(Although the object of enchantment has left us, the aura of its presence persists).

The State

For the direction and management of the affairs of the State, there are the *ulil amri minkum 4-59* –those in command among you. Law making is a continuous process of state and human development under the ambit codes of Quraan, which forbids personality cult: "*yet there are people who chose to **believe in beings** that allegedly rival God, loving them as only Allah should be loved* (2-165)", is exemplified by the very fact that even the Muslim era, year, month or day of the week are not named for the exalted first head of State. Nor are Muhammad's year of birth or death highlighted in history of Islaam, despite the fact that, the person is called

"*favour to believers* -3-164"and "*mercy from God* -28-46", but simply by the momentous event of the Hijra--the break from all forms of Meccan idolatry to the establishment of Tawheed, monotheism as established in the Islaamic State of Medina. It was Muhammad Rasullullah's message that elevated mankind to the position *worthy of dignity (17-70)* in equality for **all**.

The parity of Quraan and Hadis

Quraan is the Divine book of instructions from God, given to the Rasool and **Hadis is man-made stories and reports** by men and women, about Muhammad the man. When Quraan is recited, only the name of omnipresent, omniscient, omnipotent Allah is invoked. Whereas when Hadis is quoted, mortal men such as Bukhari, Muslim etc and strings of narrators are recalled to mind and wether it is Sahi-true- or any of the myriad of other gradations of its authenticity. If Hadis was to be taken as an article of faith then one must be aware that another authority such as man or men and other books in the context of Iman are introduced in the ad-Deen besides that of Allah. HE says **"*Indeed HE it is who (only) ordained the Quraan for you*" (28-85).**

"*Such are revelations of God, which WE rehearse to you in truth. In which* ***Hadis*** *besides the revelations of God would they believe?"* (45-6). It is replete with protestations that it explains itself. Therefore the genesis of Hadis cannot be in "*Qaala Rasullullah*- that is, the messenger said", in his personal context. But should be 'Qaala Muhammad ibn Abdullah', for the sayings are man's-bashar's- sayings.

The apologist for Hadis may wish to argue that the meaning of *Hadis* in above verse is not the same as the Hadis books on the alleged sayings and actions of the Messenger. It is their prerogative to argue so! But whatever meaning is deduced, it relates to material external to Quraan (31-6). Iman in any *external material* therefore is a declaration of ones **lack of trust** in the Quraan. Faith in Hadis on par with Quraan is therefore manifest ***Dualism.***

However it is accepted that Hadis may have its place for a research student in the study of history, politics, Khulafaa Rashideen, culture, norms and understanding the psyche of the community of people of the time when it was compiled. Acquisition of knowledge, scientific(45-13), historical (22-46) and archaeological (47-10) is also an obligation upon a Muslim and Quraan is replete with such exhaltations -- "*Oh my sustainer, make increase in my knowledge"* 22-114 for one.

Factions / Sects

No reference to Muslim Ummah is complete today without the mention of the two main divisions of Muslims namely, the major factions of **Sunni** and **Sheia.** There is only one nation (Ummah) of Islaam. From Noah- Nooh in Arabic- all the Rusul

(messengers) brought the same message of the code ad-Deen. "*The same Deen has HE established for you as that which HE enjoined on Noah—the which WE have sent by inspiration to you, and that which WE enjoined to Abraham, Moses and Jesus that you should firmly establish the Deen and make no divisions therein….*"42-13. Reverential adherence to one or the other denomination is therefore shirk. In the words of Fazlur Rahman, an eminent scholar, who writes in his book "Revival and Reform in Islam… "In the final analysis the only justification for the Shia as a separate entity is purely negative: their anti Sunnism"- of course the corollary for the existence of Sunnis viz a viz Sheias is equally unjustified according to the above verse! The Messenger was instructed not to associate with people who divide the Ummah; hence its division is Shirk.

In any discussion of Islaam, "deen-wa-mazhab" is blurted out as if one is complementary to the other. Yet nothing can be distant from each other. The Deen emanates from the holy book called Quraan as shown above, and the Mazhab named after the various Imams who put their own stamp on the rituals and practices for the communities under their spell (30-32). They often contradict each other even in major issues of law, as is evident with the differences of laws and opinions between Hannafi and Shafayi Fiqh, for example. It is to be expected, for after all *they are man made laws with much discrepancy* (4-82) and as such they cannot be Quraanic ordinances.

The infallibility of Imam is therefore out of question. Their pronouncements cannot be holier than the Quraan. Only Allah is infallible. Differences of interpretation and understanding not withstanding, the only book of law is the Quraan for *the Mutaqeen-the God conscious* (2-2). To stipulate that Hadis or any other manmade command is an article of faith "to uphold" or to enact laws based on it or to follow one particular 'imam', at the expense and hatred of the others, or in fact to follow dogmatically any Imam at all is contradiction in terms of Quraan and therefore ***Dualism.*** In the flow chart for Iman there is no legitimate path for any thing else other than Quraan!!

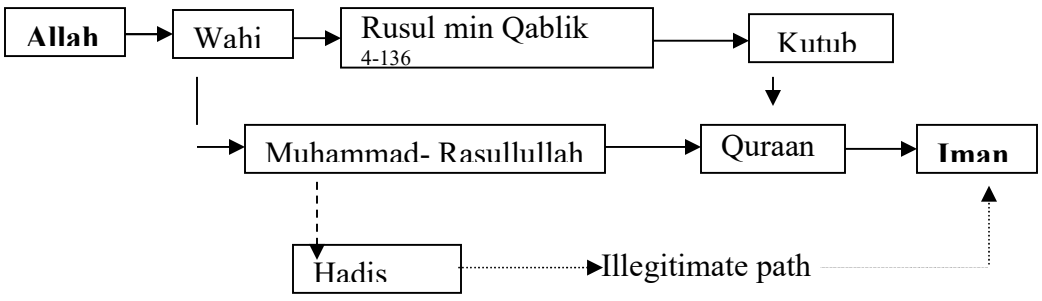

Gender Dominance (Majazi Khuda -Earthly god)

In the context of the gender structures, the Muslim Husband is the real master inside and out side the home, brutal in physical strength, bread winner (economic master) and backed by the male chauvinistic interpretation of the divine verses such as *4-34,* the male has well and truly '*established*' himself upon his complementary partner. One of the Hadis alleges that "Rasullullah said- if allowed by Allah, he would have ordered the wife to worship the husband as god incarnate". What a shame that majority of ill informed men and women believe that to be a true statement**.** ***A Rasul could never have even contemplated such a Dualism.***

ARE THERE ANY MORE SKELETONS IN THE CUPBOARD OF THE 'RELIGION' OF ISLAAM? But then Islaam is not a religion, that is, a set of meaningless man-made rituals, but an ad-Deen, the code for Muslims to live their life by. – (Refer "Islaam a challenge to Religion" by G A Parvez).

Cause and Effect

So, is there dualism among Muslims, that is, are there imposed man-made authorities other than Allah? That is authorities, which command outside the ambit of Quraan? The answer has to be in affirmative.

i-The Rulers (autocracy)

Unelected, fraudulently chosen, dynastic or inheritors of power and leadership, the temporal authorities, the gods on earth who control every aspect of their subjects' life, disenfranchise them, expose them to poverty and humiliation while squandering the wealth and resources of the country. The second Khalif Abu Bakar Siddique himself empowered the community with '**peoples power**' to depose him, should he *transgress from the right path* in the governance of the State. That is, the ruler and the ruled were put on par (17-70). Obey the leader but only as long as his actions are legitimate. This is the basis of *Islaamic democracy*; where as our 'leaders' have mutated into *Firauns* and use the country as their fiefdom, amass immense wealth, not only in their own countries but also in the so called safe haven countries of their overlords, to which they have surrendered the sovereignty of their nations.

One is entitled to ask a few questions;- why is their own country not a safe haven for them and its citizens? Why is there flight of capital and brain drain to the very countries, which humiliate and use them as door-mats? Why are they so insecure that they have to pollute the city squares and public places with billboards with their grotesque portraits, depicting themselves like the pagan gods?

ii-The Priesthood (theocracy)

The self-canonised living saints- the Ayatullahs, the Maulanas -the slave masters, for that is what *maula* means; the Ulemas, ah indeed-the Scholars!-the supposedly custodians of all knowledge. If only these spiritual potentates had "contemplated" the verse 35-28, they would realise the irony that the word *Ulemaau* –the people endowed with **true** knowledge- appears in one of the verses most prolific references to scientific disciplines, from climatology to genetics, they will see that an Aalim is - "*…among HIS servants those truly are in **awe** of Allah who have (true) knowledge! 35-28".* The humility that comes with real knowledge is the key attribute of a scholar. Indeed knowledge is power but *humility* that goes with it is the**,** *crown*.

*"But none believed in Moses except some children of his people, because of the fear of Pharaoh and his chiefs, lest they should persecute them; and certainly Pharaoh was mighty on **the earth** and one who transgressed all bounds" – 10-83.* Tyranny/ arrogance and knowledge have nothing in common.(It is note worthy that the youth of the nation is expected to stand up to the abuse of power in the above verse).

To invite discourse and challenge to ones ideas is the strength of conviction and is a vital part of knowledge. In another popular tradition Muhammad **is alleged** to have said that differences of opinion in his community is a blessing. Common sense tells us that he ***could not have said that ikhtilaaf*** which is ruinous(3-105), is better for the community, let alone advocate seventy factions. An example of strategy by the elite to confuse, divide and maintain hold on power 9-34 but for small returns 9-9.

iii-Quraanic knowledge

Lack of knowledge therefore is enslavement by the powerful of the ignorant and the weak. Acquisition of basic Quraanic knowledge is not only the right of every Muslim but a prerequisite, in order to be a Muslim. It is not just the prerogative of the professional priests *displaying their piety* (107-6), in flowing-gowns. The holy Book reminds them to be truthful, "*would you, now look down with disdain on a tiding like this and make it your daily bread (as it were) to call the truth a lie? (56-81,82)*- M.Asad*"* They do not add an iota to the progressive thought process of argumentative Islaam as portrayed in Quraan nor to the relevant big-picture-issues affecting Muslims of the time, for their own training precludes such matters and their self interests dictates the strategy they have adopted. Could it be that this frustration led Dr Iqbal to lament:-

What is a nation and what are the realities of nations!

Alas, how would these two-rakaat-imams ever comprehend!! – The 'priest' or imam referred to here is not the individual person but a mind-set. Two rakaat Imams, sums up the profession of priesthood, which has no place in Islaam.

iv-Intellectual void

Unfortunately it is equally true that the priests' utterances are taken by the audience to be *divine* and hence believed to be the truth. That is a manifestation of their intellectual void and the societies' abrogation of responsibility to acquire and impart knowledge and therefore the resulting ignorance and humiliation. The clergy easily usurped the power in the void thus created!!

v-Gender Issue

The lap of the mother, the cradle of childhood knowledge, the foundation on which the edifice of a nation is expected to be raised, must be of the soundest design and material otherwise the outcome is a disaster. The *majazi khuda* -the assumed gods have left no room for female gender to manoeuvre in society let alone to acquire knowledge; knowledge of their rights in society as women. It is not surprising that there is a Surah named *Nisaa (women)* but not Rijaal (men). It is therefore imperative that the Muslim States must take full responsibility to change the situation and legislate for preferential treatment of girls in education and take 'affirmative action' to redress centuries of neglect, if it wishes to build a sound Muslim Ummah. In the absence of such actions, is it any wonder that the Ummah has invited upon itself the wrath of God?

In particular the illiteracy of the Muslim women is lamentable. The status quo is diligently maintained, lest the acquired knowledge inform the women of their God given rights to the detriment of the powerful *Qawamoon*. The case of the medical doctor Taslima Nasreen from Bangladesh should be studied vigorously, as being typical of Muslim society, for she could have been a heroine for Muslim women! Having seen and heard her interviews and that of her village mullah in the Western media years ago, one was appalled at the level of ignorance portrayed by the teacher, the community in general, the family and the pupil herself! Adults are what mothers mould them in childhood. One was filled with sympathy for the poor woman for what she was taught of Deen! Exposed to wider horizons later in her life, any wonder she rebelled? It was easy to deduce that she had not once read the Quraan with critical analysis except by rote in Arabic for the usual *thawab* in the hereafter. In its ignorance alas, the female gender however, seems to fear the freedom Quraan gives them and feels secure in the confines of the 'traditional norms', the mental chadar.

vi -Shared Responsibility

It is however too easy to heap the blame on the elite classes. For the rulers can only rule with the consent of the ruled. Muslims have abrogated their own responsibility to read, understand and act on the teaching of Quraan 2-121 and apply its core values to their daily lives *aamanu wa amilusslihaat 95-6*, believe and act. They have themselves to blame for having delivered absolute power to the clergy on the platter. The Imam therefore, automatically becomes the leader of the community! In the Western countries many **imported** imams can't even speak the countries' language, but some are even titled Mufti! They have no knowledge of the dominant religions and cultures of the country. The Media loves them, for their gaffs often add to the satire and ridicule of 'Islaam', to utter frustration of the Muslim community, particularly the modern youth!

The lack of appreciation of the synergy of peaceful application of "peoples-power" and basic knowledge of Quraan in the Muslim community is shamefully absent (exception is recent Iran, where the Crown was exchanged for Gown!). Is it because the *fear of the Pharaohs and his chiefs***-** the crown and the gowns? It is not in the nature of tyrants to be benevolent towards the weak. Or is it that the lethargy that comes from waiting for Allah to correct all their ills, without any endeavour on their collective part; except for the violent individual or small-group reactions to tyranny as exemplified today in Bali? It is a reflection of **Quraanic illiteracy** of the Muslim masses. Eradicate it and there will be no need for such misguided actions.

The de-facto temporal and spiritual leaders, the potentates who pitch themselves as gods on earth**,** are equally duty bound to eschew their dualism with God and set free the minds of ordinary people. The mind-set of servitude to power, internally cultivated over the centuries and externally imposed (and often invited), as the present-day circumstances demonstrate; have produced the traumatic situations Muslims find themselves in. One can almost hear Mohammad Rasullullah repeat the Rasool Mose's call in frustration "let my people go" so that Islaam may be projected into the wider world in its true, progressive, tolerant and self confident form, beyond the confines of vested interests, dogmatism and fanaticism. Muslims are ordained to exercise their responsibility-***"your responsibility is not only to follow Allah's guidance yourself – you are an Ummah raised for the good of all humanity 3-110"***

Conclusion

A part cannot be greater than the whole. Fragmentation of ad-Deen is therefore the fragmentation of Islaam. Humiliation is the natural outcome of factionalism and divisiveness, for "***ikhtilaaf incurs dreadful penalty****"* –(3-105)

Differences of opinion in arguments based on the 'details' not given in the Quraan are acceptable, as Quraan itself extols the virtue of intellectualism over and

over again, viz the use of:- *taffakur 34-46, tadabbur 47-24 albaab 3-190, absaar 24-44*, *etc and warns against the danger of not using the grey matter –aqal 59-14.* What is not allowed is the break up of Tawheed 'the one-ness', in this wrangle of opinion!

Therefore, isn't it about time in the 21st century, with its technological communication advantages, for the Ummah to come to an universal agreement on Quranic core values for all to agree and adhere to. An inter mazaahib representatives' (scholars') and Muslim states representatives' *dialogue* is long overdue! Again as Fazrul Rahman in his book says, "The principles of the Quraan deserve systematisation and then from these law should be systematically derived".

There is no shortage of capital resources or of true scholarship in the so-called Muslim world to set up an international **unifying institution** to undertake such a task. Would any oil rich Muslim State or an existing international body put it's hand up, and would the Scholars come down of their ivory towers and talk to the masses in *their* language? Again in the words of Iqbal:

> *"Nature often turns a blind eye in individual's case but it never forgives the sins of the community"*

To achieve the *unity of (all) Humanity (2-213)* is perhaps a very distant dream, however it is essential to build **now** on the divine and emotional cohesion of Muslims that is put together with the Quraanic stitches of Millat and Ikhwah-brotherhood, (sisters are included in the "hood"). The ikhwa is supple and flexible to accommodate the intellectual differences of opinion without the ***irreconcilable rancour*** of the past thousand years. The grace of Allah could still be, as it was with the earlier Muslims to join their "*hearts in love so that by HIS grace you became brethren (3-103)";* for they belonged to the one family.

The concept of family includes ***the head*** of the family and demands special commitment to it from all the family members (ummah), and their solidarity. It is the creation of that one ummah and its head which is the imperative today for those in authority, the scholars and the common Muslims, without gender exceptions (3-195,33-35); our collective responsibility, to eradicate Dualism. As Iqbal so aptly summarised:

> **"Although the community has idols lurking under its sleaves I am but ordered to proclaim <u>Lailaahaa illallaah</u>".**

****

Journeying with Uncle Iqbal Khawaja

By
Saima Hameed
****

I would like to talk about Uncle Iqbal Khawaja's vision for the youth. Uncle Iqbal truly believed that the youth could build a future of hope, even in this time of despair.

He dedicated a substantial portion of his life to the dissemination of the message of the Quran. Not only was he actively involved in collaborating with others to translate the works of Ghulam Ahmed Perwez but he was also involved in interperating the message and spreading it through the mediums of plays, dramas and even poetry.

I remember how ecstatic he was when he heard the speech of a young Muslim scientist from India i.e Dr Aslam Pervaiz. Soon after we created 'The Next Step'; which was supposed to be a forum of the youth that rationally engaged with each other but whos ultimate aim was the pursuit of knowledge so that we could be brought closer to the Quran.

The 'Next step' produced its first play written by Uncle Iqbal Khawaja called 'Promise'. In it the message that he had portrayed was that Muslim Youth had alot to be proud of their own Muslim civilisation which existed near the time of our Rasool. The key to success was to revert to the same lines as our Rassol (saw) and this could be done by being proud of our heritage - whose seeds could even be seen as far as Spain, when Khalid conquered it and the center of learning in Europe had become 'Cordebba' and 'Granada'.

Uncle Iqbal Khawaja also encouraged the youth to write and take out our own newsletter to disseminate the same message. I had the opportunity to read several of Uncle Iqbal Khawaja's articles. He was a man searching for the truth and questioning, then challenging existing norms. He questioned how media was being used and abused...how our youth were being drugged by being exposed to fantasies and the way the very notion of 'development' had become the wanting of 'big beautiful ' cars and 'big beautiful bungalows' and also the increasing but ever subtle vulgarity creeping into our television channels.

He was also highly sceptical of the escapism which comes about through the use of the prayer mat - in which man believes that by reverting to God five times a

day, he can absolve himself of all the wrong doing which the Quran otherwise forbids. In short he was against secularism and believed in the unity of faith - the unity of deen and dunya.

I don’t know exactly what I am trying to say - maybe I have lost my chain of thoughts in the rush of ideas which spur when I remember him.

In the end, I would like to say that Uncle Iqbal Khawaja believed that destiny was in mans own hands and that we were responsible for all our actions. As the verse of the Quran reverberates the plea of the Rassol. i.e (which is something like) " O my Rabb, Increase me in Knowledge"; similarly Uncle stressed the pursuit of knowledge and even education so that the Muslim Ummah could emancipate itself. I remember oncle Uncle Iqbal saying to me,

"Beta, get your LLB's, BA's and BSc's even if it is only to give Burhan i.e evidence to others that you have gone through what they call is the ultimate. But do not become like them i.e do not become westernised - and then you can present your evidence, not forgetting your texts - so they will have no chance but to accept them." And this he said was the course taken by Sir Syed, Allama Iqbal and Quaid-e-Azam.

May Allah (swt) bless his soul.

****

Justice or Just Ice III

By
Aboo B. Rana

The wind gusts are strong, yet still;
I keep my flame burning.
For the Man, to whom was granted,
From Truth! The humbleness of nature. _Iqbal
****

As I sit in front of my computer to narrate my story, my head bows in memory of Parwez. May his soul rest in peace. I'll say, he was a man for all seasons, to anyone who wants to describe him in one phrase. He labored hard in the last three decades of his life in particular, just to explain to the rest of us the meaning of Islam. Just like his predecessors, Sir Syed Ahmad, Sir M. Iqbal and Jinnah did before him. The Islam they projected was not a religion. They refreshed Islam as an ideology, a way to live, as a system, narrated within the Quran. All of these revivalists of Islam had one thing in common among them. All these leaders of Islam, changed the world around them without guns. Peace was their goal in life. And peacefully but firmly, they conveyed their messages to their audiences.

In my previous epistle, I was of the opinion, the present state of affairs do not harbinger any signs towards a peaceful Islamic Government, anywhere in the world. The scientists are the only lot among human beings, who seem to be tolerating, understanding and forgiving each others mistakes, no matter which nation they belong to. Life can never develop and grow, amid the utterly pessimistic attitudes we maintain toward present systems. Wars will never vacuum clean, as some of us believe, the Earth we inhabit. The only other alternative would be to migrate to another planet which gives license to live; since Noah[PBUH] also arranged for his followers, however small in number they were, in the face of the coming disaster and took them away to a safe place. Moses[PBUH] was told to take his people away from Pharaohs' suppressive government. The humanitarian acumen of Muhammad[PBUH] also advised his followers to migrate to Medina, in an extremely adverse situation, away from the existing melodramatic beliefs of idolatry, which was choking humanity. Why should it come as a surprise, if we talk of migrating to another life giving planet. It is, I'm sure you will realize, almost impossible, to convince anybody towards my views, in this short space and time. I will not deny that my thoughts must have made sense to some, to most others, it might have been a jubilating nonsense,

like the intoxication of a matured wine. At the same time, not to say anything on such an important subject, I consider, is also a blunder.

Since most of us are still accustomed and intimately in touch with the hedonistic Islam that surrounds us, we embrace it as motherly love. All the more so when we have not experienced the invigorating and refreshing beauty life offers in the real Islamic government and which Quran is trying to make us visualize. This may explain why we have not collectively achieved the actual momentum towards an Islamic system, which wants to be explored, hibernating in the words of Quran. Our attitudes can never be changed in parts. "The main reason why such attitudes are difficult to change," says Dr. Brown, "is they have arisen at a very early age and early impressions are the most fixed being, in fact, personality traits; each item of the attitude is correlated with many other items and therefore cannot be changed piecemeal…….But society is not a homogeneous mass, since it is composed of groups of people ranging from the large more or less deliberately organized bodies with specific aims which are described as 'secondary groups' and include religious and political organizations, professional associations, trade unions, the services, and so on, to the 'small primary groups' informally coming together with a dozen or fewer members who may have no other aim than enjoyment of each other's company. Society could indeed almost be said to be based on such primary groups (which include the family group) as its fundamental units rather than on a horde of unrelated individuals as was at one time believed." Unless all the different groups, associations and unions of a society confine themselves within the framework of Quran, I do not think that we will ever be able to evolve into an Islamic government. Particularly in our present circumstances, where, either a Muslim is disillusioned by former senseless practices and traditions and now feels no shame in using Islam as means to further his/her goals. Or the orthodox group of Muslims with a sense of integrity, who prefer to adhere to their old impetuous traditions, come what may. In both cases, we do not find any attraction towards Islam as a system. Only in as much as the society of the individual allows it in its daily life.

A rose or any other sweet smelling flowers, take it to any part of the world, ask anyone with a healthy nose to smell it. There will be no two opinions. Let a newborn child lick the taste of honey and do the same to another person of any age. The same delightful response. Ask any two sane individuals, anywhere in the world, how much is three and three. The only difference, if any there be, will be in the language. Ask a rational mind, how to make holy water. "Boil the hell out of it," shall be the simple reply. Ask any astronomer in the world, where is North? They will all guide you in the same direction. Now ask any two Muslims, what is the meaning of the word "Allah." That, you will be told, is a personal matter. Why? Is not Quran the same book, with exactly the same words?

“I don’t have time for religion.” I like the stupidity, or perhaps the audacity of the one, who rather prefers to switch on the TV. In a way, you will tell me, it makes sense. He wants to take care of the present and wants the future to take care of itself. Fine and dandy. Ask the person again. Ask him, what guarantee is there, the structure or plan he is working on today, shall bring rewards in his afterlife? If he/she cannot throw you out of the room, he/she will certainly ask your leave. If he/she has mellowed with age or become exasperated from the crude experiences of life, the response will still be very disconcerting or doltish. You will be, by asking these questions, blocking their way, from letting them relish the joys of life. Or the fruits of his/her hard labour. These questions put their powers, whatever little has been gained, in jeopardy. Since there is no palatable answer in their smorgasbord. Yet, we all want to continue with our Life? We will not jump off a forty storey building for a billion rupees. It means instant death. And we will not stop cheating each other, time wise or otherwise. For we are not convinced, if cheating kills our souls or spirits, that reside somewhere within us. “Logic or no logic,” you will be told, “it’s a very practical way of living!” Perhaps so? “There was no need,” Goethe thought, “to visit a madhouse to find lunatics. So numerous are the illusions, frenzies, hallucinations afloat in the world that some thinkers are of the opinion that our planet was the asylum of the universe for disordered minds.”

It is not, in our logic or whatever we say, which is awesome enough. It is in our beliefs that we advocate. Some beliefs, if we care to think, are in fact very amusing. Walking on red hot ambers, to purge ourselves. Or how will you explain an Indian fakir, in the Himalayas, standing with his arm lifted high up in the air on one leg, hoping one day to see his Creator. And attain Nirvana. What kind of a god is that, who wants his creation, to starve in hunger, and then expects us to change this world into a heaven. ‘High Hopes,’ is all I will say. Just to keep the flame of freedom burning, I’ll wish the fakir best of luck in his endeavours. Or, with all respects, where is the sense in drinking a glass of water, dipped with Quran scripts written on folded slips of paper. For those naïve folks, who have been made to feel stupid until their mental faculties have reached a point of inertia. And are only trying to borrow or trust a mind, other than their own, to extinguish their ills. I can understand the witchcraft and other atrocious rituals, practiced by the Mayas, Incas, Indian fakirs and all, of bygone civilizations. Where lies the explanation of cheating and usurping the rights of simple folks, on purpose? And calling it a practical way to live. Please do spare me of this logic. It does not exist in my books.

Unless these cults and superstitious rituals and traditions are not wiped clean, in an organized manner from the minds, there lies little hope, in making people understand what Quran, or for that matter, any logic. Working to bring a radical change without eradicating senseless and irrational old traditions, is only adding one

more fantasy to the list of all others, among which we all have been brought up. "Oblation," in whatever form, must be deleted immediately from the dictionary of Islam. The supremacy of Islam can never be proved, by compulsively and perpetually doing what Non-Muslims are doing. Allah demands no offerings from us. Contrary to "religion" which is always demanding, and with no guarantee for the rewards. Another alternative is to wait, until the culture becomes sick, bored, tired and disillusioned of outrageous rituals and superstitious beliefs, if we desire a real Heaven. Yet another alternative lies in transferring all matters in God's hands. God will take centuries, that is certain! In the words of Parwez, "Allah is in no haste, as He has no death to face." Therefore Allah is going to take all the time. With us mortal beings, our story is being made in different dimensions. When its time for our curtain to fall and say our final farewell, "They were" shall be the only words by which we will be addressed in future. How many of us are actually being missed, from the millions and millions that have treaded this earth. Gentle minds! To bring a change we need, first and foremost, to have a clear vision. I know of no other short cut.

There is, these days, a whole lot of drawing room talk about 'values.' Whose values are these subtle elites, hovering over us, discussing about? Gentle hearts! Let's be honest with ourselves, if we are planning to make sense. If any there is left, in our lives……. Life is serious business, accept it or not. Plenty of times we have experienced, in our history of blood baths, sheer naked force is no permanent help in solving the mysteries of Life. Once again we have experienced the very recent shedding of Afghan blood, of journalists and reporters, of army and air force officials from other nations. The story is not yet finished. And it has neither reached any satisfactory conclusion nor consolidated our security. Who can we claim the permanent winner? To whom must be given the trophy of victory in all these past twenty years of human history? The women beaten by the Taliban, the hand-chopped-desperate criminals. Innocent small children, who I am very sure, have never seen a smile on any adult's countenance in years. Perhaps, most of these children there, do not even know what a smile is. Despair after despair after despair. This has been their lessons for life for our little siblings. Not to mention the way the Twin Trade Centers were demolished and the waste of human lives.

Life is our responsibility. Surely Allah wants us to know this fact very clearly. Furthermore, is Allah willing to pay the bill for these damages? Don't look at me for the answer. Who am I? Or at those who shamelessly used and hijacked Islam. They are history now.

"Thah'ree ye'hee agar, shert e ves'saal e Laila;

Mera as'teefa, ba hasrat au yaas!" (Urdu)

The ‘Satanic Verses’ by Salmon Rushdie ought to have been a wake-up call for the Muslims all over the world. That something very terrible is brewing. The Islam that Salmon had learnt or what he read and observed around him was certainly very weak. As usual, none of us had time for his religious paraphernalia. The Bosnians and Chechnians were being beaten to death. The Kashmiri is being abused in the divided Valley. The Arab monarchs were melting in the heat of the deserts. Or, perhaps concentrating on the Palestinian case. The western nations were busy trying to adjust their live styles in the upcoming Information Technology. The whole matter was plainly overlooked, except for a few columns in newspapers and magazines. At the most Imam Khomeini promised a ransom on Salmon’s head, if I recall correctly. Who cared? But the unavoidable aftermath, in the form of the unspeakable terror attacks and I need not repeat again what followed after that. We mortals were forced to face the nemesis of nature. Is it the final one? You are pulling my leg……. You think you can find a corner of Paradise for yourself in this burning Inferno? Did Dante find any?..... After all this, must we Muslims insist there is class in the present day Islam. Reminds me again of a repartee from Parwez on this. “The ‘C’ has vanished, and ‘lass’ is all that we are left with now.” So much so of just ice in our Islam. I’m sorry, my apologies, I meant the Justice in our Islam.

Friday, August 16, 2002

****